ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۲۱

دوسرا سال: نویں کتاب

ستمبر ۲۰۰۴ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان

ای میل: angarey@poetic.com

فون: ۰۶۱-۵۲۳۴۸۶ ، ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶

مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان

قیمت: تیس روپے

زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

مضامین:

۲۔ علمبردارِ اقبال: جگن ناتھ آزاد کا سفرِ آخرت — ڈاکٹر معین الرحمٰن — ۵

۳۔ لوحِ سیہ رنگ پہ جگنو لکھنے والا شاعر۔ انور مسعود — ڈاکٹر طیب منیر — ۱۴

۴۔ عالمگیریت اور تیسری دنیا — ناصر حسین بخاری — ۲۱

۵۔ ناولاتی تخلیقیت کا قطبی ستارہ — محمد حامد سراج — ۲۹

۶۔ ادب اور معروضی حقیقت (جمالیات ۱۱) — ابن حسن — ۳۶

کہانی:

۷۔ نجات — رابندر ناتھ ٹیگور/ نیر عباس زیدی — ۴۶

سلسلہ وار ناول:

۹۔ ایک مرد (قسط ۱۳) — اوریانا فلاشی/ خالد سعید — ۵۶

غزلیات:

۱۰۔ غلام حسین ساجد — دس غزلیں — ۶۰

۱۱۔ خاور اعجاز — چار غزلیں — ۶۵

۱۲۔ ڈاکٹر خیال امروہوی — چار غزلیں — ۶۹

۱۳۔ فہیم شناس کاظمی — تین غزلیں — ۷۱

۱۴۔ اوصاف نقوی — دو غزلیں — ۷۲

۱۵۔ محمد فیروز شاہ — دو غزلیں — ۷۳

۱۶۔ عطاالرحمٰن قاضی — دو غزلیں — ۷۴

۱۷۔ ظفر اقبال نادر — ایک غزل — ۷۵

۱۸۔ طارق عزیز — ایک غزل — ۷۵

حروفِ زر:

۲۰۔ قارئین کے خطوط — بنام مرتب — ۷۶

سید عامر سہیل

چند باتیں

کیا کیا جائے کہ جب ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں اور سماجی، سیاسی، معاشی، علمی اور ادبی صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے شخصی اور اجتماعی رویوں کو دیکھتے ہیں تو ماسوائے مایوس اور دل گرفتہ ہونے کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ اخبار، ٹی وی، رسائل غرض کسی میڈیا کو دیکھ لیں آپ کو ہنگاموں، اموات، تشدد کے واقعات اور لوٹ مار کے اور کچھ سنائی اور دکھائی نہیں دے گا۔ ان اس صورت حال میں کم از کم میرے لئے مایوس ہونے کے سوا کوئی دوسرا راستہ رہ نہیں جاتا۔ گزشتہ شمارے میں ''چند باتیں'' کے حوالے سے دوستوں کو گلہ تھا کہ میں نے تصویر کے تاریک پہلو کو زیادہ دکھایا اور مایوس کن گفتگو زیادہ کی تھی۔۔۔ حالانکہ مسائل کے ساتھ ساتھ ان کا حل بھی تو بتایا جا سکتا تھا۔۔۔؟ نیز کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم زندگی کو بہتر بنانے کا جتن کریں۔۔؟

میرے خیال میں بھی اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ ہم ان باتوں کی طرف بھی متوجہ ہوں جو مسائل کے حل کا راستہ دکھاتی ہیں لیکن پھر ایک لمحے کے بعد یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ ہمارے یہاں اس انداز کی تجاویز سے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ ہزاروں منشور، اور لاکھوں دستاویزات اپنے روشن حرفوں کے ساتھ تاریخ کے اندھیر خانوں میں وقت کی گرد تلے دفن ہو چکے ہیں۔۔۔ تحریر و تقریر کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو تاریخ عالم پر محیط ہے، لاکھوں ریفارمر، ہزاروں دانشور اور سینکڑوں اصلاح پسند تحریکوں کے سنہری حروف انہی تجاویز سے بھرے پڑے ہیں جن میں مسائل کا حل موجود ہے تاہم اس سارے کے باوجود وہ کیا کمی ہے جو ان حروف کو اعتبار بخشنے سے عاری ہے، یہ بولتے اور سمجھاتے حرف اب گونگے کیوں ہو گئے ہیں؟ سوال صرف یہی ہے۔۔۔؟

ہمارے یہاں بہتری کی رائے اور پر امید تجاویز کا طویل سلسلہ موجود رہا ہے اور آج بھی ہے مگر اس کے باوجود انسانی سرشت کی کج روی بہر حال اپنا رنگ دکھاتی ہے، اس پر مزید یہ کہ ہمارے یہاں عدم مساوات، انصاف کی عدم دستیابی، طبقات، جبر، تشدد، بے بسی ایسے عوامل مل کر ساری صلاحیتوں کو چھین لینے کے لئے کافی ہیں اور بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ لفظ کے ساتھ ہمارا تعلق محض نبھانے کی حد تک ہے۔

یہ ساری صورت حال اپنی جگہ مگر ہمارے یہاں لکھنے اور سوچنے والوں کے یہاں ایک عجیب و غریب بات دیکھنے میں آ رہی ہے اور وہ یہ کہ ان کی تحریروں میں وہ منطقی ربط نہیں ہے جو کسی بھی تحریر کی اصل

طاقت ہوا کرتا ہے۔ ایک نہ سمجھ میں آنے والی جذباتیت اور کھوکھلا پن ہے (جو یقیناً ہمارے معاشرتی رویے کا عکاس ہے)۔ اس جذباتیت سے بچنے کا حل بھی صرف یہی ہے کہ ہم اپنی تحریروں میں منطقیت اور استدلالیت کو فروغ دیں۔

کہنا صرف اتنا ہی ہے کہ جب ہماری تحریریں منطق اور دلیل سے عاری ہوتی چلی جائیں گی ہم اسی طرح منشوروں، دستاویزات اور قراردادوں کو بے اثر ہوتا دیکھیں گے۔ اور اگر دلیل اور منطقی تسلسل کے ساتھ بات کریں تو شاید پڑھنے والے کو ہمارے لکھے لفظوں پر اعتبار آ ہی جائے۔

☆☆☆

سعادت حسن منٹو کی پچاسویں برسی کے موقع پر

جنوری ۲۰۰۵ء میں

انگارے کا

منٹو نمبر

شائع کیا جا رہا ہے

آپ سے گزارش ہے کہ منٹو کے حوالے سے اپنی شخصی، تنقیدی اور تحقیقی تحریریں

یکم دسمبر ۲۰۰۴ء

تک ارسال فرما دیں۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

علمبردارِ اقبال: جگن ناتھ آزاد کا سفرِ آخرت

آل احمد سُرور (وفات: فروری ۲۰۰۲ء)، علی سردار جعفری (وفات: اگست ۲۰۰۰ء) اور جگن ناتھ آزاد (وفات: جولائی ۲۰۰۴ء) ___ یہ ایک طلائی مثلث تھی جس نے قیامِ پاکستان کے بعد (جب بھارت میں علامہ اقبال کا نام لینا یا اُن کے فکر وفن کو موضوعِ تحریر بنانا ایک طرح سے ناقابلِ معافی ''جرم'' کے مترادف تھا) ___ اقبال کا نام اعتماد اور احترام کے ساتھ لیا اور سربلند کیا ___ اقبال دوستی کے پس منظر میں آلِ احمد سُرور اور علی سردار جعفری اپنے آپ کو ''اقبالی مجرم'' کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

اِس سلسلۂ اقبالیات کی تیسری بڑی کڑی اور نشانی جگن ناتھ آزاد (ولادت: عیسیٰ خیل، ضلع میانوالی، ۵/دسمبر ۱۹۱۸ء) کی ذاتِ گرامی تھی جن سے ہم جولائی ۲۰۰۴ء میں محروم ہوئے۔ وہ تلوک چند محروم (ولادت: یکم جولائی ۱۸۸۷ء، وفات ۶/جنوری ۱۹۶۶ء) کے بیٹے تھے جنہیں ڈاکٹر زینت اللہ جاوید نے علامہ اقبال کے حلقۂ احباب میں شمار کیا ہے(۱)۔ اس طرح اقبال سے دل بستگی کا حصۂ وافر آزاد کو اپنے والد سے ارثاً ملا۔

علامہ اقبال کے سانحہ ارتحال کی خبر ریڈیو پر آئی تو جگن ناتھ آزاد کے بقول والد تلوک چند محروم: ''کہنے لگے ایک دو شعر میں لکھواتا ہوں، تم لکھ لو۔ میں نے کاغذ پنسل ہاتھ میں لی۔۔۔ نوحے کے (آخری دو شعر یہ تھے):

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق — روشن تر اس حقیقتِ روشن کو کر گیا
محروم کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو — یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا

دوسرے دن اقبال کے ماتمی جلسے کا پروگرام طے ہوا۔ اب کے خراجِ محبت اُنہوں نے رباعیات کی صورت میں ادا کیا(۲)۔ اقبال کے بارے میں تلوک چند محروم کی دو رباعیات اور ایک قطعہ دیکھیے (۳)

اقبال کی موت پر بپا ماتم ہے — اے اہلِ وطن ! بہت بڑا ماتم ہے
نغموں سے کہو کہ آج نالے بن جائیں — رضوانِ ریاضِ شعر کا ماتم ہے
کم تر ہے حکیم ہند اگر تجھ کو کہوں — یا لعلِ گلیم ہند اگر تجھ کو کہوں
اللہ سے ہم سخن ہوا تو اکثر — زیبا ہے کلیمِ ہند اگر تجھ کو کہوں
دہرِ فانی سے ہو گیا رُخصت — وہ دلِ اہلِ ہند کا محبوب
وائے افسوس ہو گیا بے وقت — علم و حکمت کا آفتاب غروب

اس طرح دیکھیے تو اقبال سے دل بستگی کا حصۂ وافر، جگن ناتھ آزاد کو اپنے والد تلوک چند محروم

سے ارثاً ملا۔ آزاد نے ۱۹۵۵ء میں اقبال پر لکھنا شروع کیا۔ اقبال کے بارے میں اُن کے تالیفی اور علمی کارنامے متعدد کتابی صورتوں میں ملتے ہیں:

۱۔ اقبال اور اس کا عہد، ۱۹۷۳ء — ۲۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ۱۹۷۶ء
۳۔ اقبال: زندگی، شخصیت اور شاعری (متعلّمین کے لیے) ۱۹۷۷ء
۴۔ بچوں کا اقبال، ۱۹۷۷ء — ۵۔ مرقّع اقبال، ۱۹۷۷ء
۶۔ اقبال اور کشمیر، ۱۹۷۷ء — ۷۔ فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو (تالیف)، ۱۹۸۲ء
۸۔ Iqbal: His Poetry & Philosophy, 1982
۹۔ Iqbal: Mind and Art, 1983
۱۰۔ محمد اقبال۔ ایک ادبی سوانح حیات، ۱۹۸۵ء — ۱۱۔ اقبال کی کہانی، ۱۹۸۸ء
۱۲۔ ہندوستان میں اقبالیات اور دوسرے توسیعی لیکچر، ۱۹۸۹ء
۱۳۔ ترجمہ ''جاوید نامہ'' (اقبال)
۱۴۔ رُودادِ اقبال، جلد اوّل (۱۹۰۰ء تک مفصّل سوانح حیات)

آخری دو کتابوں کے حوالے ملتے ہیں، کتابیں نہیں ملتیں ___ یہ زیرِ طبع ہیں۔

جگن ناتھ آزاد ماہر و عاشقِ اقبال ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھے۔ وہ متعدد شعری مجموعوں اور مختلف اصنافِ نثر میں کوئی پچاس کے قریب کتابوں کے خالق تھے۔ وہ اُن خوش قسمتوں میں تھے، جو اپنی زندگی ہی میں تحقیق و تنقید اور توجہ کا موضوع اور مرکز بن جاتے ہیں۔

میرے ایک عزیز شاگرد کو، میرے ذخیرۂ کتب سے ابتدائی سرسری کاوش سے جگن ناتھ آزاد کے بارے میں درج ذیل مآخذ کو الگ کرنے میں کامیابی ہوئی:

۱۔ سہ ماہی ''توازن''، مالیگاؤں، مہاراشٹر، گوشۂ آزاد، ۱۹۸۴ء
۲۔ ماہنامہ ''العطش''، جموں، جگن ناتھ آزاد نمبر، ۱۹۸۶ء
۳۔ ''جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ''، محمد ایوب واقف، دہلی، ۱۹۸۸ء
۴۔ ''پروازِ ادب''، پٹیالہ، جگن ناتھ آزاد نمبر، مئی جون ۱۹۸۸ء
۵۔ سہ ماہی ''لمحے لمحے'' بدایوں، جگن ناتھ آزاد نمبر، ۱۹۸۸ء
۶۔ ''جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری''، حمیدہ سلطان احمد، دہلی ۱۹۹۱ء
۷۔ ''ارمغانِ آزاد''، ڈاکٹر ظہور الدین احمد، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء
۸۔ ''جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات''، ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی، ۱۹۹۳ء
۹۔ ''جگن ناتھ آزاد۔ ایک مستقل ادارہ''، نذیر فتح پوری، دہلی، ۱۹۹۸ء
۱۰۔ ''جگن ناتھ آزاد۔ فکر و فن''، محمد منظور علم، دہلی، ۱۹۹۹ء

۱۱۔ ''جگن ناتھ آزاد۔ بطور نثر نگار''، عاصمہ عزیز، جموں، ۲۰۰۳ء

وہ صاحبِ علم اور صاف گو انسان تھے۔ اُن کی روشن خیالی اور بے تعصبی کے ہزاروں اہلِ قلم گواہ ہیں۔ محبت اُن کا ایمان اور مسلک تھا۔ انکسار اور وقار اُن کا امتیاز تھا۔ وہ خوش گفتار اور وضع دار بھی بلا کے تھے۔ ایک صاحبِ کمال عالم اور باکمال صاحبِ قلم کا ہمارے درمیان سے اُٹھ جانا ایک بڑا المیہ اور عذاب ہے۔ اُن کی فردِ عمل خدائے بزرگ و برتر کے ہاتھ میں ہے جو بڑا ستّار العیوب اور غفور الرحیم ہے۔ خدا انہیں اپنے سایۂ رحمت میں لے اور اُن کے متعلّقین، اُن کی تین بیٹیوں اور دونوں بیٹوں اور اُن کی بیگم صاحبہ کو ہمت اور آسانیوں سے ہم کنار کرے اور رکھے۔

پچھلے اٹھائیں برس سے میری اُن کی یاد اللہ تھی۔ عمر اور علم کے واضح فرق اور فاصلے کے باوجود اُنہوں نے مجھے ہمیشہ عزت اور اہمیت دی۔ حفظ مراتب کا خیال اور دھیان رکھنے والے وہ بہت مہذب اور شگفتہ منش انسان تھے ہر معنوں میں ایک بڑے انسان۔ ہمارے درمیان وقفوں وقفوں سے مراسلت کا سلسلہ بھی استوار رہا۔ میرے نام اُن کے بعض خط بلا مبالغہ کئی کئی صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ خط کیا ہیں، ان کی حیثیت تو یادنگاری یا روداد نویسی کی سی ہے۔

کچھ عرصے سے مَیں اپنے ذخیرۂ مکاتیب کو سمیٹنے سنوارنے میں لگا ہوا ہوں۔ ایسے دوستوں اور بزرگوں کے خط یکسو کرنا میری ترجیح رہی ہے جو، اب ہمارے درمیان نہیں۔ جگن ناتھ آزاد زندگی سے اس درجہ بھرپور، متبسّم اور متحرک شخصیت کے مالک تھے کہ حاشا، کبھی حاشیۂ خیال تک میں یہ نہ آیا کہ یہ گونجتا، گنگناتا ساز دیکھتے ہی دیکھتے بے آواز ہو جائے گا! اُن کی یادیں ہیں کہ ہجوم در ہجوم پیچھا کر رہی ہیں جنہیں گرفت میں لینے سے بالفعل، لفظ عاجز اور قاصر ہیں:

کیا خبر کیا بات اُس کے کفر میں پوشیدہ تھی
ایک کافر، کیوں حرم والوں کو یاد آیا بہت!

مَیں اپنے (یا دوسرے احباب کے) نام آئے اُن کے خطوط کو ابھی اپنے ذخیرے سے الگ اور اکٹھے نہیں کر سکا۔ سرِ دست اُن کے چند مختصر خط الگ کر رہا ہوں:

۱۔ پروفیسر رشید احمد صدّیقی کے ایک خط کا اقتباس، بنام آزاد، ۱۳/ مارچ ۱۹۷۳ء
۲۔ جگن ناتھ آزاد، بنام: پروفیسر زہرا معین، ۲۹/ اگست ۱۹۷۶ء
۳۔ جگن ناتھ آزاد، بنام: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ۲۱/ جولائی ۱۹۸۵ء
۴۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، بنام: جگن ناتھ آزاد، ۷/ جون ۱۹۹۲ء
۵۔ جگن ناتھ آزاد، بنام: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ۲۰/ جون ۱۹۹۲ء
۶۔ جگن ناتھ آزاد، بنام: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ۱۱، ۱۲/ مئی ۱۹۹۴ء
۷۔ روزنامہ ''انقلاب'' لاہور، ۵/ ستمبر ۱۹۴۷ء کے تراشے کا عکس اور قلمی عکسِ تحریر آزاد، ۲۵/ دسمبر ۱۹۹۹ء

قیامِ پاکستان (۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء) کے فوراً بعد لاہور میں ہنگاموں کی آگ بھڑک اُٹھنے کے خون آشام ایام میں آزاد اپنے مسلمان دوستوں کی پناہ میں تھے۔ اُن کے والدین راولپنڈی میں اُن کی گمشدگی سے حد درجہ ہراساں رہے۔ اُنہی دنوں روزنامہ ''انقلاب'' (لاہور) میں اُن کے حال احوال کی اطلاع فراہم کرنے کی اپیل چھپی۔ روزنامہ ''انقلاب'' ۵/ ستمبر ۱۹۴۷ء کا یہ تراشہ بھی (بعنوان ''مسٹر جگن ناتھ آزاد کہاں ہیں؟'' میرے ذخیرے سے نکل آیا۔

پہلا خط آزاد کے نام پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ایک خط کے اقتباس پر مشتمل ہے جسے آزاد نے مجھے ارسال فرمایا۔ اقبال سے آزاد کے گہرے شغف کو دیکھتے ہوئے رشید صاحب نے آزاد کے بارے میں جس امکان اور پیش بینی کا اظہار کیا ہے مَیں اسے از قسم ''بشارت'' خیال کرتا ہوں۔ چار خط آزاد کے ہیں۔ درمیان میں ایک خط راقم الحروف (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، الوقار، ۵۰-لوئر مال، لاہور-۱) کا ہے جسے سیاق و سباق کی ضرورت سے دینا پڑ رہا ہے۔ جملہ اصل خط میرے ذخیرے میں محفوظ ہیں۔

[۱]

رشید احمد صدیقی، بنام: جگن ناتھ آزاد

علی گڑھ ۱۳/ مارچ ۱۹۷۳ء

اقبال پر آپ کی نظر جس طرح عالمانہ اور reverential ہے، اُس کی مثال کم ملتی ہے۔ میرا خیال ہے اور دُعا بھی کہ آپ کو اقبال پر کہنے کا استناد کا درجہ حاصل ہو جائے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن دُور نہیں ہے۔ آدمی طرح طرح سے پہچانا جاتا ہے اس میں ایک یہ بھی ہے کہ اُس کا محبوب شاعر کون ہے؟

رشید احمد صدیقی

[۲]

گرامی نامہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، بنام: پروفیسر زہرا معین

جگن ناتھ آزاد
پریس انفارمیشن بیورو،
۲۹/ اگست ۱۹۷۶ء
فون دفتر: ۳۲۶۴ اور ۲۴۱۴ گھر: ۲۸۷۴

محترمہ زہرا معین صاحبہ، تسلیم

اس خط کی حیثیت محض ایک سلامِ روستائی کی اور میں اس کے لیے معذرت طلب ہوں۔ کہنا یہ ہے کہ آپ نے ۱۹۷۴ء میں اپنے کالج (اسلامیہ کالج برائے خواتین، کوپر روڈ، لاہور) کے میگزین ''محمل'' کا اقبال نمبر شائع کیا تھا۔ اگر اس کی ایک جلد عنایت فرما سکیں تو آپ کا احسان ہو۔

والسلام
جگن ناتھ آزاد

[۳]

گرامی نامہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، بنام: ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

شعبۂ اُردو، جگن ناتھ آزاد
جموں یونیورسٹی، جموں ۱۸۰۰۰۱ ۲۱/جولائی ۱۹۸۵ء

محبِّ صادق ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب، آداب

''راوی'' (رسالہ، گورنمنٹ کالج، لاہور) کے شاید دو یا تین اقبال نمبر نکلے ہیں۔ مجھے ان اقبال نمبروں کی ضرورت ہے۔ اگر یہ سب یا ایک یا دو بھجوا سکیں تو آپ کا کرم ہو۔ ملاقات ایک مدت سے نہیں ہوئی: کشتی شکست گانیم اے بادِ شُرط بہ خیز۔ خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔

نیازمند
جگن ناتھ آزاد

اس خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔ (آزاد)

ایک زحمت اور بھی دے دوں۔ از راہِ کرم ایک شمارہ بھجوائیں یا دو یا تین، رجسٹری سے بھجوائیں۔ یہ آپ کا کرم بالائے کرم ہوگا!

[۴]

خط ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن، بنام: پروفیسر جگن ناتھ آزاد

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن
گورنمنٹ کالج، لاہور ''الوقار'' ۵۰-لوئر مال، لاہور-۱
۷/جون ۱۹۹۲ء فون: ۶۵۹۰۰۰

محبِّ گرامی جگن ناتھ آزاد صاحب، سلام شوق

پرسوں پنجاب یونیورسٹی بورڈ آف اسٹڈیز (اُردو) کے اجلاس میں ایم۔اے (اُردو) کے آپ کی نثر نگاری پر تھیسس کی تجویز زیر بحث آئی اور حسبِ خواہ منظور ہوئی۔ مقالہ نگار ہوں گی: عزیزہ عاصمہ عزیز اور نگرانِ کار رہیں گے: ڈاکٹر سلیم اختر۔

مقالہ ہمیں اس سال کے اواخر (بحدِّ آخر اپریل ۱۹۹۳ء تک) مکمل کرانا ہے۔ آپ کی توجہ اور تعاون کے ہم ممنون رہیں گے۔

اس خط کے ساتھ شعبے کا ریسرچ جرنل ''تحقیق نامہ'' آپ کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اس کا دوسرا نسبتاً ضخیم شمارہ پریس میں ہے۔ پسند آئے گا۔

میں نے رشید احمد صدیقی کے خطوں کا ایک مجموعہ ترتیب دیا ہے۔ یہ اسی برس انشاء اللہ چھپ جائے گا (۴)۔ رشید صاحب پر اپنے ایک مضمون میں آپ نے اُن کے کچھ خطوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ خط اگر

آپ مرحمت فرمائیں تو خوشی ہوگی۔ آپ کے زیرِ اثر حلقۂ احباب سے بھی رشید صاحب کے خطوں کی نقول میسر آسکیں تو سوا کرم ہوگا۔ یہ سطور بڑی عجلت میں گھسیٹ رہا ہوں۔ جواب کا انتظار رہے گا۔

مخلص
ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

[۵]

گرامی نامہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، بنام: ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

ساؤتھ ایشین پرفارمنگ آرٹس کونسل آف امریکہ سرپرست: جگن ناتھ آزاد
۶۰۳۳ نارتھ شیریڈن روڈ، سوٹ ۴۰ جے صدر: افتخار نعیم
شکاگو ایسنوائس ۶۰۶۶۰ ۲۰/جون ۱۹۹۲ء

محبِّ گرامی قدر (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)، آداب

عنایت نامہ ۷/جون کا موصول ہوا:

جائے مشام دیدہ کشودم بہ بوئے گل
پنداشتم کہ گردِ رہ یاری رسد

اس اطلاع سے دلی مسرت ہوئی کہ عزیزہ عاصمہ عزیز کے تھیسس کی تجویز بورڈ آف اسٹڈیز (اُردو) کے اجلاس میں حسبِ خواہش منظور ہوگئی ہے۔ آپ کا عنایت نامہ ملنے سے دو دن قبل ہی میں نے مندرجہ ذیل کتابوں پر مشتمل ایک پارسل رجسٹری کے ذریعے سے ڈاکٹر سلیم اختر کے نام اُن کے گھر کے پتے پر بھیجا ہے:

۱۔ بوئے رمیدہ (مجموعۂ کلام) ۲۔ نوائے پریشاں (مجموعۂ کلام)
۳۔ جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری (حمیدہ سلطان احمد)
۴۔ جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ (محمد ایوب واقف)
۵۔ اقبال اور اس کا عہد ۶۔ ہندوستان میں اقبالیات۔ آزادی کے بعد
۷۔ گہوارۂ علم و ہُنر (مجموعۂ کلام) ۸۔ Ajanta طویل اُردو نظم کا انگریزی ترجمہ

شاید ایک آدھ کتاب اور بھی ہے۔

ان میں بعض کتابیں تو ہیں ہی میری نثر پر مشتمل اور جو شعری مجموعے ہیں، اُن میں بھی میری نثر کے نمونے مل جائیں گے۔ ''حرفِ اوّل'' یا ''پیش لفظ'' کی صورت میں۔ یہ نمونے بچی کے مقالے کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

انہی تمام کتابوں پر مشتمل ایک پارسل آپ کے لیے بھی تیار ہے۔ دونوں اکٹھے نہ بھیجنے کا سبب یہ ہے کہ جب بھی ایک ہی طرح کے کتابوں کے پارسل ایک ہی روز یا پھر دو چار دن کے وقفے سے

احبابِ پاکستان کو بھیجے ہیں تو وہ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچے۔

معلوم نہیں یہ رکاوٹ ہندوستان کے ڈاک خانے والے پیدا کرتے ہیں یا پاکستان کے ڈاک خانے والے یا ہندوستان کے کسٹم والے یا پاکستان کے کسٹم والے۔ اس لیے مناسب طریقہ جس پر میں عمل کرتا ہوں یہ ہے کہ احبابِ پاکستان کو کتابیں ایک ہفتے کے وقفے سے بھیجتا ہوں۔ اس صورت میں یہ مکتوب الیہ تک پہنچ جاتی ہیں۔

آپ کے ساتھ ملاقات کالج میں غالباً ۹ رمئی کو ہوئی تھی۔ اسی شام کو قیام گاہ پر آ کر معلوم ہوا کہ سینیٹ ہال میں اگلے روز میرا لیکچر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ تاریخ Tentatively طے کی گئی ہے کیوں کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اگرچہ ملتان میں مجھ سے اس لیکچر کا ذکر کیا تھا لیکن چونکہ میں ملتان سے اسلام آباد اور وہاں سے کراچی جا رہا تھا، اس لیے میرے لاہور پہنچنے کی تاریخ نہ مجھے معلوم تھی اور نہ ڈاکٹر وحید قریشی کو۔

اب ۱۰ رمئی کو لیکچر کی تاریخ مقرر ہوئی اور ۱۰ رمئی ہی کو مجھے دہلی روانہ ہوتا تھا۔ دن کے بارہ بجے ایئرپورٹ پر میرا رپورٹنگ ٹائم تھا۔ اس لیے میں نے ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب سے کہا اگر ممکن ہو تو لیکچر صبح نو بجے رکھا جائے۔ انہوں نے میری تجویز مان لی اور میں کوئی ساڑھے گیارہ بجے فارغ ہو کر وقت پر ائیرپورٹ پہنچ گیا۔ اگر اس لیکچر کا پہلے سے علم ہوتا تو میں آپ کو اور دوسرے احباب کو ضرور اس کی اطلاع دیتا۔۔۔۔ خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔ (ناتمام)

نیازمند: جگن ناتھ آزاد

[۶]

گرامی نامہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، بنام: ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

(جموں)

۱۱، ۱۲ رمئی ۱۹۹۴ء

محبّ و مکرم (محترم) پروفیسر سید معین الرحمٰن:

دہلی کے سفر میں آپ کا گراں بہا تحفہ ''غالب نامہ'' (تجزیاتی مطالعہ) (۶) موصول ہو گیا تھا

کس منہ سے شکر کیجیے اس لُطفِ خاص کا

آپ نے تو ۴۲۴ صفحات میں بند ایک انسائیکلو پیڈیا مجھے بھیج دی ہے۔ جزاک اللہ!

عاصمہ اعجاز نے اپنے والد محترم کی یاد میں جو اشعار کہے ہیں (۷)، اُن کا جواب نہیں۔

خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔

نیازمند: جگن ناتھ آزاد

روزنامہ ''انقلاب'' ۵ رستمبر ۱۹۴۷ء کے تراشے کا عکس، نیز عکسِ تحریر جگن ناتھ آزاد، ۲۵ ردسمبر ۱۹۹۹ء

پچھلے مہینے (۱۵ رجون ۲۰۰۴ء کو) جموں (توی) سے اُن کا بھیجا ہوا ایک پیکٹ مجھے ملا جو میری ایک عزیز اور لائق شاگرد عاصمہ عزیز کی کتاب ''جگن ناتھ آزاد۔ بطور نثر نگار'' پر مشتمل تھا۔ ایم اے (اُردو) کا یہ تھیسس میری تجویز اور تحریک پر ۱۹۹۳ء میں شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج لاہور میں لکھا گیا اور اب ۲۰۰۳ء میں یہ جموں سے کتابی صورت میں چھپا۔

پیکٹ پر میرا اور اُن کا ایڈریس خود اُن کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ پیکٹ سے کوئی خط نہ نکلا۔ پندرہ بیس دن انتظار کیا کہ خط شاید انہوں نے الگ سے پوسٹ کیا ہو۔ زیادہ دیر ہوئی تو میں نے اُنہیں ۲۴ رجولائی ۲۰۰۴ء کو درج ذیل خط لکھا:

محترم جگن ناتھ آزاد صاحب ۲۴ رجولائی ۲۰۰۴ء

آپ کی نثر نگاری پر عزیزہ عاصمہ عزیز کی جموں سے چھپی ہوئی کتاب کے چند نسخے ملے خوشی ہوئی ضمناً اندازہ ہوا کہ میرا پیکٹ اور فرمائش گویا آپ تک پہنچی۔ بعض استفسارات پر آپ کے ردِعمل کا اشتیاق تھا۔ کتابوں کے پیکٹ میں کوئی خط نہ نکلا، خیال ہوا کہ اس کے مناقب خط آتا ہوگا، اب اتنی دیر

ہوگئی ہے لیکن خط نہیں ملا۔ توجہ فرمائیے۔

پچھلے برس اگست میں بیگم سرفراز اقبال (اسلام آباد) کا ناگہاں انتقال ہوا۔ ان کے بارے میں ایک کتاب ان کے چہلم ہی پر آ گئی تھی۔ ''سرفراز اقبال۔ نعت وافادت کا استعارہ'' اس میں آپ کے ایک خط کا عکس بھی شامل ہے۔ اس کتاب پر بھی آپ کا تاثر نہ پایا، انتظار اب بھی ہے۔ اگست کا اواخر میں اُن کی پہلی برسی پر ایک یادگار مجلّہ چھپے گا، آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ کاش اس سے پہلے آپ کا خط آ جاتا!

خیریت کا طالب اور اپنے پچھلے خط کے جواب کا شدت سے منتظر۔

آپ کا: معین الرحمٰن

مجھے ایک دو تعزیتوں کے لیے فیصل آباد جانا پڑا، وہاں سے واپس آ کر، خود پوسٹ آفس جا کر جگن ناتھ آزاد کو بصیغۂ رجسٹری یہ خط روانہ کیا۔ یہ ۲۷ر جولائی ۲۰۰۴ء کی بات ہے۔ رجسٹرڈ خط بھیجنے کے کچھ ہی گھنٹوں بعد پی ٹی وی لاہور کے پروگرام منیجر عزیزی فرخ بشیر کی زبانی ''ڈان'' اخبار کے حوالے سے یہ اندوہناک خبر پائی کہ پچھلے ہفتے دہلی میں جگن ناتھ آزاد کا انتقال ہوا:

حفیظ خوشنوا بزمِ سخن میں قیامت تک رہے گی یاد تیری
نشاط آگیں ترے نغماتِ رنگیں غم افزائے جہاں فریاد تیری
کیا پابندِ نَے ، نالے کو تو نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد تیری (۸)

حواشی اور حوالے:

۱۔ ''تلوک چند محروم۔ شخصیت اور فن''، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۷۳۔
۲۔ ''حیاتِ محروم، تلوک چند محروم: شخصیت اور فن''، دہلی، ص ۷۸، ۷۹۔
۳۔ ایضاً، ص ۸۰
۴۔ افسوس کہ رشید احمد صدیقی کے خطوں کی طباعت بوجوہ ٹلتی چلی آ رہی ہے۔
۵۔ اس طویل گرامی نامے کا کم وبیش دو تہائی حصہ سرِ دست اختصار کے پیشِ نظر روک لیا ہے۔
۶۔ ''غالب نامہ کا تجزیاتی مطالعہ''، تھیسس ایم۔اے (اُردو) از: عاصمہ اعجاز، طبع اوّل، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لاہور، ۱۹۹۴ء، طبع دوم: الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء۔
۷۔ یہ اشعار پروفیسر سجاد باقر رضوی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں اور مقالہ نگار کی ذہنی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔
۸۔ ان اشعار کے خالق تلوک چند محروم ہیں، دیکھیے: حیاتِ محروم، از: جگن ناتھ آزاد، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶۵۔

☆☆☆

ڈاکٹر طیب منیر

لوحِ سیہ رنگ پہ جگنو لکھنے والا شاعر۔ انور مسعود

پچیس تیس سال اُدھر کا قصہ ہے کہ پروفیسر انور مسعود کچھ رفقاء کے ساتھ بسلسلہ تدریس راولپنڈی سے گوجر خاں کا سفر بذریعہ بس کیا کرتے تھے۔ دورانِ سفر پڑھے لکھے اصحاب کے درمیان کیا کیا دلچسپ موضوعات پر باتیں نہیں ہوتی ہوں گی۔ انور مسعود سفر کی سنگینی کو کم کرنے کے لئے لہر میں آ کر اکثر رنگین اور نومولود اشعار بھی سنا دیا کرتے تھے۔ ایک رفیقِ سفر پروفیسر محمد اکرم (جو خود بھی انگریزی ادبیات کے رازدان تھے) ان کے فی البدیہہ اشعار سن کر فوراً اپنے کان پکڑ لیتے اور گویا ہوتے کہ ''آئندہ سالوں میں آپ نے تو مشہور ہو جانا ہے اور ہم یہیں کہیں آپ کو حسرت سے دیکھا کریں گے۔'' پروفیسر اکرم کی پیشن گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی ہے۔ دنیا کا وہ کون سا براعظم ہے جہاں انور مسعود کو پڑھ کر، سن کر اور حیرت وحیرانی سے کان پکڑنے والے موجود نہیں ہیں۔

انور صرف مشاعرے لوٹنے والا ہی شاعر نہیں بلکہ اُس نے مزاح نگاری کی گل کاریوں کے ساتھ سنجیدہ نگاری میں بھی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ وہ اُردو اور پنجابی زبان کا ایسا سفارت کار ہے جس نے ہمارے بے مصرف سفارت خانوں سے بدرجہا زیادہ اپنے وطن اور زبان کو متعارف ومرغوب بنایا ہے۔ اُردو نثر کے طرح دار ادیب مختار مسعود نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''انور مسعود اہلِ مزاح اور اہلِ کمال کے قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے قبیلے کی آنکھ کا تارا ہیں ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے۔''

انور مسعود اپنے اسلوبِ حیات میں ایک درویش صفت انسان ہے۔ درویشی کے یہ عناصر اُس کی شعری زمینوں میں جا بجا کونپلیں نکالے نظر آتے ہیں۔ آگے چل کر اس حوالے سے بھی چند باتیں ہوں گی۔ فی الحال اس بات پر چند جملے لکھنا ضروری ہیں جس کی طرف مختار مسعود نے اشارا کیا ہے کہ ہمیں انور کی قدر کرنی چاہی۔ ہم نے اُس کی قدر یہ کی ہے کہ نظم ونثر میں اتنے وقیع ووزن دار کام کے باوجود اُس کو بہت دیر سے حسن کارکردگی کے صدارتی ایوارڈ کا مستحق سمجھا گیا، حالاں کہ ناکردہ کاریوں پر بہت سے ایسے خود ساختہ ادیبوں کو اُن کی تصانیف نامربوطات پر ایوارڈ مل گئے جو طبع ہوتے ہی نامطبوع ٹھہریں اور داخلِ دفتر ہوئیں۔ انور کی تخلیقات داخلِ نصاب بھی ہوئیں اور وطن اور وطن سے باہر اہلِ فکر ونظر سے خراجِ تحسین بھی حاصل کیا۔ اب تک انور مسعود کی یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔	میلہ اکھیاں دا (پنجابی کلام)	۱۹۷۴ء
۲۔	قطعہ کلامی	۱۹۸۶ء
۳۔	فارسی ادب کے چند گوشے	۱۹۹۳ء

۴۔	غنچہ پھر لگا کھلنے	۱۹۹۶ء
۵۔	ھن کیہہ کریئے	۱۹۹۶ء
۶۔	تقریب (مجموعہ مضامین)	۱۹۹۷ء
۷۔	شاخِ تبسم (مزاحیہ شاعری کا سنجیدہ انتخاب)	۲۰۰۰ء
۸۔	اک دریچہ، اک چراغ	۲۰۰۰ء
۹۔	میلی میلی دھوپ	۲۰۰۲ء

ان کتابوں میں دو کتابیں پنجابی شاعری کی ہیں جو اپنے انداز و اسلوب، خورد بینی مشاہدے اظہارِ بیان اور ندرتِ خیال کا شہ کار ہیں۔ تین نثری کتب ہیں اُن میں تحقیق و تنقید کی رنگارنگی بھی ہے اور مصنف کے ذہن و ذوق کا خوب صورت عکس بھی۔ ''فارسی ادب کے چند گوشے'' نہایت دلچسپ کتاب ہے جو انور کی فارسی دانی اور تنقیدی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

> ''اُن کی نثری تصنیف ''فارسی ادب کے چند گوشے'' اپنے دل نشین انداز اور مطالعیت کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ اعلیٰ تنقید اور تدریس میں جو قدرِ مشترک ہے وہ پڑھنے والے میں موضوع سے دلچسپی کو شیفتگی کی حد تک پہنچانے کا فریضہ ہے۔ پروفیسر انور مسعود نے یہ بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ ان موضوعات پر اس سے زیادہ دل کش، رواں اور شوق کو مہمیز کرنے والا تعارف میری نظر سے نہیں گزرا۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی پر نظر کرتا ہوں تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اگر سنِ وسال کا تفاوتِ بے جا درمیان میں حائل نہ ہوتا تو میں ایسے اُستاد کا شاگرد ہونا اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتا۔''

تین کتابیں شعری اصناف قطعہ، غزل، نظم، تراجم و متفرقات پر محیط ہیں۔ قطعہ نگاری میں انور مسعود نے وہ انداز ایجاد کیا ہے جس سکہ رائج الوقت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ معاشرتی مسائل و مصائب کو ان زاویوں سے چار چار مصرعوں میں پابند کیا ہے کہ سننے والے تادیر مسرت سے ہم کنار رہتے ہیں۔ ان قطعات میں شاعر کی بذلہ سنجی جس طرح برقی رو کا روپ دھارتی ہے پڑھے، سننے اور محسوس کرنے کی چیز ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے ایک سانس کی صنف یعنی قطعہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انور مسعود کے قطعات پر رائے دی ہے کہ:

> ''اس ایک پُر فسوں سانس میں انہوں نے طنز و ایجاز کے جو گل کھلائے ہیں وہ ان کے فن کا اعجاز ہے۔ سادگی اور شگفتگی اُن کے قطعات کا جوہر اور دھیما پن اور شائستگی اُن کے لہجے کی پہچان ہے۔ وہ تحریف، تضمین ایسی فن کارانہ مہارت سے کرتے ہیں کہ اصل کو بھی اپنا ہی کرشمہ کلام بنا کے دکھا دیتے ہیں۔''

اُردو میں مشاعروں کی مستند تاریخ تو کیا ان پر کوئی غیر مستند چیز بھی نہیں لکھی گئی۔ مشاعرہ کسی زمانے میں ایک ادبی، تہذیبی ادارے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ بتدریج اُس کے مقاصد و منشا میں تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔ فی زمانہ مشاعرہ اور مشاہرہ ہم معنی الفاظ ہو گئے ہیں۔ موجودہ برق رفتار دنیا میں جہاں شعراء کی گرم بازاری ہے اور اُن کے ہاتھوں شاعری کا میعار مندے کا شکار ہے؛ وہاں انور مسعود جیسے پڑھے لکھے شعرا بھی موجود ہیں جنہوں نے شعر کو وقار دینے کے ساتھ شاعر کو بھی سامعین کی نظر میں محترم بنا دیا ہے۔

انور مسعود نے مشاعروں کے ذریعے زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ وطن سے دور مصروفِ مشقت، اپنے وطن کی ہواؤں، فضاؤں اور زبان و ادب کو ترسے ہوتے ہزار ہا لوگوں کے لئے خوشی اور خوش مزگی کا سامان بھی فراہم کیا۔ موجودہ دور میں دنیا بھر میں ہونے والے مشاعروں کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو اُس میں انور مسعود کا نام ایک رجحان ساز شاعر کے طور پر آئے گا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے انور مسعود کو پہلی بار برسرِ مشاعرہ ہی دریافت کیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر انور مسعود کو پہلی بار میں نے دبئی کے اُس عالمی مشاعرے میں دیکھا اور سنا جو میری صدارت میں ہو رہا تھا۔ کلام سنا تو اچھا لگا۔ پڑھنے کا ایسا دل کش انداز کہ ہر لفظ سننے والے کے دل میں اتر جائے۔ سامعین کی بے ساختہ داد سے سارا پنڈال گونج اُٹھا اور واہ واہ سبحان اللہ کی داد سے چھتیں اُڑ گئیں۔ ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ گفتگو بھی لچھے دار کرتے ہیں۔ مسکراتا چہرہ اور چہرے پر اخلاص کی روشنی۔ اسلام آباد میں ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ موصوف صرف شاعر ہی نہیں ہیں صاحبِ علم بھی ہیں۔ وسیع المطالعہ، لفظوں کے پارکھ اور فارسی ادب کے اُستاد۔ فارسی ایسی بولتے ہیں جیسے شعر سنا رہے ہیں۔ آج دنیا بھر میں اُن کی مانگ ہے اور مشاعروں کی جان ہیں۔ جدید و قدیم فارسی ادب ہر ایسی نظم کہ کم کم دیکھنے میں آتی ہے۔ خوش مزاج، خوش نظر اور خوش فکر بھی۔''

دنیا بھر میں انور مسعود کی مانگ مزاح گو شاعر کی حیثیت سے تو ہے ہی، وہ صاحبِ علم بھی ہیں اس وجہ سے عام لوگ تو اُن کو سنتے ہی ہیں۔ پڑھے لکھے اور ذی علم اصحاب میں بھی اُن کی بڑی قدر و منزل ہے۔ جمیل جالبی صاحب نے انور مسعود کے وسیع المطالعہ، لفظوں کا پارکھ، فارسی دان، خوش نظر اور خوش فکر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ شخصیت اور فن کے یہ سب پہلو یک جان ہو کر اُن کے شعری مجموعے ''اک دریچہ اک چراغ'' میں نظر آتے ہیں۔ اُن کے مزاح میں نفاست اور طنز میں جو شگفتگی ہے اُس سے تو ایک دنیا واقف ہے۔ اُن کے مذکورہ مجموعے میں غزلوں، نظموں، ترجموں میں جو انفرادیت سامنے آتی ہے اُس نے موصوف کے ایک اور رُخ کو اُردو دانوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہنسنا ہنسانا بھی بڑی بات ہے لیکن سنجیدہ نگاری سے قارئین کے دل و دماغ کو آمادۂ فکر کرنا اور اپنے لطیف جذبوں میں دوسروں کو شریک سفر

کر لینا اُس سے بھی بڑی بات ہے۔

انور کا مشاہدہ قابلِ رشک ہے، پھر اظہار پر کامل عبور بھی اُن کو معاصر شعراء میں ممتاز کرتا ہے۔ غزل میں بانکپن کے ساتھ ایک نیا پن بھی ہے۔ بالخصوص نظموں میں انہوں نے مشاہدے کی ثروت مندی کو اس ڈھب، ڈھنگ اور رنگ سے استعمال کیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ ایک ایسا شاعر ہے جو اپنی فکری و تہذیبی روایت سے جڑا ہوا ہے۔ اُن کو ہم نظریاتی شاعر بھی کہہ سکتے ہیں۔ سیاسی آدمی نہ ہونے کے باوجود اُن کی شاعری میں سیاسی ارادے جا بجا نظر آتے ہیں۔ اُس کی پہلی اور آخری محبت اُس کا وطن ہے (جس کے در و بام بنانے سنوارنے اور چمکانے میں خاکِ حجاز کا غازہ اور آبِ زم زم کی نمی کا آمیزہ کام میں لایا گیا ہے)۔ انور کی شاعری میں قرآنی آیات، احادیث اور دینی اشارے ہمیں اسلامی تہذیب اور کلچر کے سائے سائے لئے پھرتے ہیں۔

گزشتہ سطور میں انور کی درویش منشی کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اندر سے فطری طور پر درویشانہ مزاج رکھتا ہے۔

بارِ اسم اُٹھایا ، رنگ نشاط دیکھا آئے نہیں ہیں یوں ہی انداز بے حسی کے

کئی سال پہلے، گرم موسم میں، عید قربان سے دو ایک روز پہلے میں نے انور کو دیکھا، قربانی کا جانور ہانکے لئے جا رہے ہیں۔ پسینے سے شرابور، ہاتھ میں ایک ناتراشیدہ سی چھڑی، شلوار کے پائنچے پنڈلیوں تک پہنچے ہوئے، چپل پر غبار کی تہیں، مشقِ سخن میں محو، من و تو سے بیگانہ تیز تیز قدموں سے جا رہے ہیں ___ درویشی و قلندری کا یہ انداز اُن کی زندگی اور شاعری میں بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اخلاص کی جو روشنی روئے انور پر ہے ویسے ہی ان کے درویشانہ انہماک کی چمک اشعار میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔

آتے نہیں انداز مجھے حسن طلب کے اے رحمتِ یزداں یہ مرا دستِ دعا ہے
امتیاز حق و باطل مجھے ارزانی کر صبح تابان و شبِ تار بنانے والے
بیٹھیے ، پیڑوں کی اُترن کا الاؤ تاپئے برگِ سوزاں کے سوا درویش کچھ رکھتا نہیں
گناہ سے بھی گریزاں رہا دلِ ترساں پہنچ سے دور تھی اقلیم پا رسائی بھی

ہر نئی چیز کو اپنا لینا اور پرانی چیزوں کو طاقِ نسیاں کی نذر کرتے جانا کوئی اچھا وطیرہ نہیں۔ نئے دور میں قدیم و جدید کی آویزش نے ایسے ایسے الاؤ روشن کئے ہیں جن سے روشنی تو کم کم حاصل ہوتی ہے البتہ گرد بیکار نے کئی حقیقتوں کو دھندلا دیا ہے۔ انور روایت سے جڑا ہوا شاعر ہے اُس کی نظر میں ہر شے میں نئے پن کی تلاش ایک بیماری ہے۔

انور زمانے کو ہے نئے پن کا عارضہ تیری سنے گا کون یہ باتیں پرانیاں
اندھیر کر دیا ہے شعاعوں کی بھیڑ نے آنکھوں میں روشنی کی پھری ہیں سلائیاں

اُس کی شاعری میں محبت کے المیے اور رومان و رمان کی بات بھی دل کش اور لذیذ حکایتوں کے روپ میں اس طرح بیان ہوتی ہے کہ ہر کوئی اسے اپنی کہانی گمان کرتا ہے۔ وہ محبت کو وقت گزاری

خیال نہیں کرتا بلکہ ایک سنجیدہ کام سمجھتا ہے۔

چلا ہے اُس کی گلی کو اُسی طرح انور سحر کو لوگ روانہ ہوں کام پر جیسے

چند اشعار اُن لطیف جذبوں کو بیان کرنے والے لکھتے جاتے ہیں جن کو حسبِ ضرورت عشق، محبت، دل لگی، باتو صیفِ حسن رہ گزر، کوئی نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

دیکھا تھا مسکرا کے کسی نے بس اک نظر پھر پھول کھل اُٹھے تھے جہاں تک نظر گئی
کب سے ترے ہونٹوں کی طرف دیکھ رہا ہوں کشکول سماعت میں کوئی پھول گرا دے
اک یہی بات کہی تھی دمِ رخصت اُس نے کیا کیا جائے ٹھہرتا نہیں لمحہ کوئی
تری جفا کا فلک سے نہ تذکرہ چھیڑا ہنر کی بات کسی کم ہنر سے کیا کرتے
ہمیں بھی بننے سنورنے کا دھیان رہتا تھا وہ ایک شخص کہ تھا ایک آئینہ بھی گیا
اے دلِ ناداں کسی کا روٹھنا مت یاد کر آن ٹپکے گا کوئی آنسو بھی اس جھگڑے کے بیچ

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ انور مسعود مغرب کے پر عیش رستوں سے بارہا گزارا ہے جہاں قدم قدم پر بے راہ رو ہونے کے وافر مواقع موجود ہوتے ہیں۔ اُس نے جامِ سفال کو آلودہ مشروبِ مغرب نہیں کیا اور نہ ہی کسی گلنار صورت نے اُن کی سیرت کو خراب کیا۔ ورنہ کتنے ہی متشاعر دیارِ غیر میں اترتے ہی میزبانوں کو اپنی نہفتہ خواہشات کو پورا کرنے کی فرمائش کر دیتے ہیں۔

تیری چاہت سے نگاہوں میں حیا تھی ورنہ کتنے منظر تھے گنہگار بنانے والے

انور وسیع النظر شاعر ہے جہاں وہ اِردگرد بسے ہوئے غموں کا ادراک رکھتا ہے وہاں عالمی مسائل بھی حیطۂ شعور میں جگہ پاتے ہیں۔

میں نے انور اس لئے باندھی کلائی پر گھڑی وقت پوچھیں گے کئی مزدور بھی رستے کے بیچ
اس وقت وہاں کون دھواں دیکھنے جائے اخبار میں پڑھ لیں گے کہاں آگ لگی ہے

شاعر کے غم نقطے سے پرواز کر کے دائرے کے دلدوز منظروں کی خبر بھی لاتے ہیں۔

اب تو بارود کا اک ڈھیر بنی ہے دنیا اب تو باقی ہے فقط ایک دھماکا ہونا
لہراتے ہوئے آئے تھے وہ امن کا پرچم پرچم کو اُٹھائے ہوئے نیزے کی انی تھی
سمٹ رہے ہیں ستاروں کے فاصلے انور پڑوسیوں کو مگر کوئی جانتا بھی نہیں

انور کے موضوعات میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ مجموعی طور پر اُس کے ہاں غم کی افزائش و پرورش زیادہ نظر آتی ہے۔

نہالِ غم نے کیا توفیق پائی برابر پھولتا پھلتا رہا ہے
بس اپنی داستاں اتنی ہے انور کہ سائے میں میں بدن جلتا رہا ہے

سب سے بڑی بات جو انور کی شاعری پڑھ کر دل و دماغ کو آسودہ کرتی ہے وہ اُن کا اپنے

عقائد سے برگشتہ نہیں بلکہ پیوستہ ہونا ہے۔ انور مسعود جہاں رومی، سعدی اور حافظ سے بین السطور راز و نیاز کی پینگیں بڑھائے رکھتے ہیں وہاں غالب و اقبال سے بھی ارادت وعقیدت کا سلسلہ دراز رکھتے ہیں۔ زیردستوں کے مصائب پر وہ خود بھی رنجیدہ ہے اور دوسروں کو بھی اپنی شاعری کے ذریعے شعور دینا چاہتا ہے۔ علاقائی سوچوں سے ماوراوہ ملی یک جہتی اور بھائی چارے کا نقیب ہے۔

ہاں مجھے اردو ہے پنجابی سے بھی بڑھ کر عزیز شکر ہے انور مری سوچیں علاقائی نہیں

غزل کے رنگِ قدیم سے جڑے ہونے کے باوجود انور کی غزل میں ایک تازگی اور انفرادی تجربے اور رنگ کا احساس ابھرتا ہے۔

اکٹھے ہو گئے تھے پھول کتنے وہ چہرہ ایک باغیچہ لگا تھا

انور کی غزل میں عمدہ اشعار کا ایک قابل قدر ذخیرہ موجود ہے جو ہر نوع کے ذہن و ذوق کو متاثر کرتا ہے۔ الفاظ کے استعمال کا ڈھنگ اُن کی اُستادانہ مہارت پر دال ہے۔ الفاظ ہی تو ہیں جن سے نظریوں اور نیتوں کا احوال معلوم ہوتا ہے۔ انور الفاظ کا بڑا پارکھ اور شناسا ہے۔ زندہ و مردہ اور کمزور و کاہل الفاظ کا امتیاز ایک ادیب و شاعر کے لئے جتنا ضروری ہے وہ سب جانتے ہیں۔ فی زمانہ عربی فارسی سے دوری اور ناواقفیت نے شعروادب کو بے ذائقہ اور بے قائدہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

افسوس ملک میں نہ رہی فارسی کی قدر
مستی اُڑی شراب سے پھولوں کی بو گئی

(ظفر علی خان)

انور عام اور پامال مضامین کو بھی اپنی ہنرمندی سے صیقل کر دیتا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اُس کے کتاب نئے اور شاداب مضامین بھی وافر مقدار میں نظر آتے ہیں۔

سوچنا، روح میں کانٹے سے بچھائے رکھنا یہ بھی کیا سانس کو تلوار بنائے رکھے
راہ میں بھیڑ بھی پڑتی ہے، ابھی سے سن لو ہاتھ سے ہاتھ ملایئے تو ملائے رکھنا
آخر کار گرے قلزم خاموشی میں اپنی آواز کا مینار بنانے والے
ایک بار آؤ کبھی اتنے اچانک پن سے نا امیدی کو تحیر کی سزا دے جاؤ
سرسبز ہوئے ایک ہمیں اشک وفغاں سے راس آئی نہ یہ آب و ہوا اور کسی کو
اُس نے پیکر میں نہ ڈھلنے کی قسم کھائی ہے اور مجھے شوقِ ملاقات لئے پھرتا ہے

''اک دریچہ اک چراغ'' میں جہاں اپنے وطن کے مسائل و معاملات کو نظموں کا جامہ پہنایا ہے، وہاں عالمی افق پر ٹھہرے ہوئے سیہ بادلوں کو بھی بنظرِ تحیر و تاسف دیکھا ہے۔ لفظی تصویر کشی انور کے فنی کمالات کی مظہر ہے۔ ۱۹۷۳ء میں آنے والے سیلاب پر، چھ بندوں پر محیط ایک نظم شاعر کے فکری و فنی مجاہدات و مشاہدات کی ایک خوب صورت مثال ہے۔

دریا ہیں کہ دھرتی کی طرف دوڑ پڑے ہیں
پانی سے اکھڑتے ہوئے پیڑوں کی پناہیں

مصرعوں میں لفظی تکرار ماحول کی معراج لہروں کو مزید معنویت سے ہم کنار کر رہی ہے۔ ایک ایک شعر میں انہوں نے سیل بلاخیز کو اس طرح مقید کیا ہے کہ پڑھنے والا خود اُس المناک منظر کا حصہ بن جاتا ہے۔

کیا حشر بپا ہے کہ اندھیرے میں اچانک
ہمسائے پہ ہمسائے کی دیوار گری ہے

کشمیر ہو یا بوسنیا انسانوں کے شکار پر شاعر کی آنکھ نم ہے، پہلے اُن قوموں کی تہذیبی اور فکری گراوٹ کا ذکر ہوتا ہے۔

اتنے بھی سفاک منافق دنیا نے کب دیکھے تھے
کتوں کا منہ چومنے والے قتل کریں انسانوں کو

اور پھر بڑی مہارت اور چابکدستی سے ظالموں کے انجام کی طرف بھی اشارا کر دیا ہے۔

ظلم وستم کی خونیں شب کا منظر بجھنے والا ہے
اک عنوان فراہم ہو گا عبرت کے افسانوں کو

انور مسعود نے زیرِ نظر کتاب میں سید ضمیر جعفری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ حرف بہ حرف خود اُن پر بھی صادق آتا ہے۔

اللہ اللہ اس کے لفظوں کی پھبن
اس کا وہ رنگِ سخن
جس طرح چشم بصیرت میں تبسم کی کرن

''اک دریچہ اک چراغ'' اُردو کے شعری ادب میں ایک خوش گوار، توانا اور باقی رہنے والا اضافہ ہے، اس سے شاعر کی شخصی، فنی اور اسلوبی جہتوں کا ایک نیا افق سامنے آتا ہے۔ عصر رواں میں انور کی شاعری نے اپنا ایک الگ ماحول اور فضا تخلیق کی ہے۔

ہر کجا بشنیدہ، انداز لطف تحسیں کردہ اند

آج انور مسعود کو جو شہرت، ناموری اور نیک نامی حاصل ہوتی ہے۔ وہ اس کے اخلاص و مروت، ہمدردی، درویشی، وطن سے محبت، اقدار کا پاس اور خوش نیت ہونے کی دین ہے۔

یہی اُس کا کمالِ فن ہے کہ وہ دل سے نکلی ہوئی بات کو فطری و اصلی اسلوب میں بیان اور پیش کرنے پر قادر ہے۔

چھوڑ تجرید و علامت کی پہیلی پیارے چھڑ قصہ کوئی سعدی کی حکایت جیسا
میری جاں حضرتِ اقبال کی بیعت کر لے میرے مرشد کا ہر اک لفظ کرامت جیسا

☆☆☆

ناصر حسین بخاری

عالمگیریت اور تیسری دنیا

عالمگیریت (Globalization) کی اصطلاح ۱۹۸۰ء کی دہائی میں زبان زدعام ہوئی۔ عالمی اور ملکی سطح پر ہونے والی مباحث میں دانشور اور عالمی سیاستدان عالمگیریت کا تصور مبہم انداز میں سامنے لائے۔ بعض اوقات عالمگیریت کے تصور کو بین الاقوامیت (Internationalization) کے تصور کے متبادل اور مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں تصورات Concepts ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ حقیقت پسند، آزاد خیال اور مارکسی مکتبہ فکر کے حامل دانشور اور فلاسفہ پچھلے کئی سو سال سے عالمگیریت کا تصور پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ تاہم اِس تہذیبی تبدیلی کے عمل کے آغاز کا تعین کرنا ایک مشکل امر ہے۔

آغاز کب اور کہاں سے ہوا۔ اس بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں ہے کیونکہ تاریخ کی زمانی تقسیم ایک پیچیدہ عمل ہے۔ تاریخ میں موجود واقعات اور ان کا تسلسل کئی عوامل کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے جو ایک مسلسل تبدیلی کے امر سے گزر رہا ہوتا ہے۔ اسی لئے شاید تاریخ عالمگیریت کے آغاز کا واضح تعین کرنے میں ہچکچاہٹ سے کام لیتی ہے۔ کچھ مورخین نے اپنے طور پر عالمگیریت کے تاریخی آغاز کے تعین کی سعی کی ہے۔ جن میں کیمبل ۱۹۹۴ء کے مطابق ''عالمگیریت کا آغاز انسانی تہذیب کے آغاز سے ہی ہو گیا تھا۔'' موڈلسکی ۱۹۸۸ء (Modelski) عالمگیریت کے آغاز کو جدید زمانے سے جوڑتا ہے۔ رابرٹ سن ۱۹۹۲ء (Robertson) کے خیال میں عالمگیریت کے تصور نے اُنیسویں صدی کے وسط میں جنم لیا۔ روزناؤ ۱۹۹۰ء (Rosenau) کے بقول ۱۹۷۰ء کی دہائی کے بعد کئی عالمی تجارتی و معاشی واقعات کے تسلسل اور عالمی اداروں کے پھیلاؤ نے عالمگیریت کے تصور کو پروان چڑھایا۔

آغاز کے زمانی تعین سے زیادہ اہم عالمگیریت کی تعریف کا تعین کرنا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف انداز میں اِس تصور کی تفہیم کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ ان میں چند کا مختصر جائزہ ہمیں اس تصور کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ انیسویں صدی کے وسط میں کارل مارکس اور اینگلز نے اپنے ایک مضمون میں عالمگیریت کے تصور کا اشارہ دیا ہے۔ ان کے بقول ''قومی اختلافات اور ان کا لوگوں میں پرچار دن بدن ختم ہو رہا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ کے پھیلاؤ سے تجارتی آزادی، بین الاقوامی تجارتی منڈی اور پیداواری ذرائع میں یکسانیت اور زندگی کے حالات میں تبدیلی کا وقوع پذیر ہونا ایک فطری اور لازمی امر ہے'' (کارل مارکس اور اینگلز ۱۸۴۸ء)۔

اِس تعریف کا سب سے اہم نکتہ قومی اختلافات اور ان کے پرچار کا خاتمہ ہے۔ کسی بھی معاشرے میں موجود قومی اختلافات معاشرے کے طبقات کی سماجی و معاشی حالات کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں۔ اِن اختلافات کا پرچار قومی سوچ پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے اور ان سے صرفِ نظر کرنا درحقیقت ایسے سیاسی و سماجی حالات پیدا کرنا ہے جس میں مخصوص طبقات کے حقوق کا تحفظ ممکن ہو سکے۔ دوسرا اہم

نکتہ ہے افرادی قوت اور عالمی تجارت کا پھیلاؤ۔ دوسرے اور پہلے نکتہ کو باہم ملا کر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ کارل مارکس اور اینگلز نے عالمی سرمایہ داری نظام کی اُس سطح کا ادراک کر لیا تھا جسے آج عالمگیریت کے پرچاوک ایسا ''ارتقائی عمل'' قرار دے رہے ہیں جس کی وقوع پذیری سے انسان کے سماجی و معاشی تعلقات کے درمیان حائل فاصلوں اور سرحدوں کی خلیج ختم ہو جائیں گی اور یہ کرہ ارض فاصلوں اور سرحدوں سے پاک ایک عالمی معاشرہ ہوگا۔ اِس دلفریب تصور کی بنیاد ایسے پیچیدہ سماجی عمل پر استوار کی گئی ہے جس میں لامحدود اور پیچیدہ ترین طریقہ ہائے تعلقات، سماجی تعلقات کی تشکیل اور انسانی معاشرے کے قیام کا کام کریں گے اور یہ سب کچھ ''یک سیارچی جز'' (One Planetary Unit) کے طور پر رونما ہوگا۔ (Martin Albro 1990) مارٹن البرو نے اس تصور کو یوں پیش کیا ہے۔ ''عالمگیریت دراصل وہ لائحہ عمل ہے جس کا بنیادی مقصد تمام بنی نوع انسان کو ایک عالمی معاشرے میں شامل کرنا ہے۔''

یہ انسانی عالمی معاشرہ کیسے معرض وجود میں آئے گا؟ تمام کرۂ ارض کے انسان پہلے سے قائم بین الاقوامی ریاستی نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس نظام کی سب سے اہم خوبی ''خودمختار ریاست'' اور ''قومی آزادی'' کا تصور ہے جس کی بنیاد قومی خودمختاری، قومی معاشرے کا قیام اور قومی ثقافتی و تہذیبی شناخت وغیرہ کے تصورات پر رکھی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر بین الاقوامیت نے سرحدوں کو جنم دے کر کرۂ ارض کے انسان کو آپس میں جڑے رہنے اور بقائے باہمی کے اُصول پر عمل کر کے انسانی ترقی کا ذریعہ فراہم کیا ہے۔ انہیں سرحدوں نے غریب ممالک، کم ترقی یافتہ ممالک اور ترقی یافتہ ممالک کے افراد کو ایک دوسرے کے ''قومی مفادات'' کا احترام کرنا سکھایا ہے۔ اس کے برعکس عالمگیریت کا عمل کمپیوٹر نیٹ ورک، انٹرنیٹ، مواصلاتی نظام، بین الاقوامی مالیاتی اداروں، ایسوسی ایشنز اور عالمی تجارتی اداروں کے ذریعے غیر محسوس طریقے پر وقوع پذیر ہے۔

انتھونی گڈنز 1990 (AnthonyGiddens) اسی عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے عالمگیریت کے بارے میں رقم طراز ہے۔ ''عالمگیریت سے مراد عالمی سطح پر سماجی تعلقات میں سرگرمی پیدا کر کے دور دراز علاقوں کو آپس میں ایسے جوڑنا ہے کہ ہزاروں میل دور ہونے والے واقعات مقامی تاثر کے حامل نظر آئیں۔'' اِس تعریف میں پیش کئے گئے تصور سے واضح ہو جاتا ہے کہ عالمی سرمایہ داری نظام کو ایک ایسا سماجی و معاشی ڈھانچہ (Socio-Economic Infra-Structure) مہیا کرنا ہے جس میں تمام دنیا کے انسانی و مادی و سائل چند ترقی یافتہ انسانوں کے تصرف میں آجائیں۔ یہی وجہ ہے کہ دانشوروں کا ایک طبقہ اِس عمل کو ''عالمی تجارتی منڈی'' کے قیام کا عمل قرار دیتا ہے۔ ''دنیا عالمی تجارتی منڈی میں ڈھل رہی ہے۔ جہاں سوچ اور پیداوار ایک ہی وقت میں ہر جگہ میسر ہوں گے۔'' (روز ابیتھ موس کنٹر Rosabeth Moss Kantar 1995) تک عالمگیریت کا یہ تصور مغربی دنیا کے لئے حکمت عملی تشکیل دینے والوں کے لئے بالکل واضح ہو چکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ پرانے سامراجی نوآبادیاتی نظام کو ''نئی شکل'' میں تیسری دنیا پر بغیر فوجی قبضہ کے کیسے مسلط کرنا ہے، تاکہ کرہ ارض کے وسائل کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ میرے نزدیک عالمگیریت کا یہ تصور دراصل دنیا کے تمام مادی اور انسانی وسائل پر قبضہ کر کے چند ترقی یافتہ ممالک کو مزید دولت سمیٹنے کا موقعہ مہیا کرنا

ہے۔ میرے اس نظریہ کی تصدیق مارٹن کاہر ۱۹۹۵ء (Martin Kohr) کرتا ہے۔ اس کے بقول ''عالمگیریت سے مراد وہ نوآبادیاتی نظام ہے جسے ہم (مغرب) نے کئی صدیوں تک تیسری دنیا پر مسلط رکھا ہے۔''

عالمگیریت کے اس نئے نظام کی تشکیل کا دائرہ عمل پورا کرہ ارض ہے۔ جسے پہلے ہی تین دنیاؤں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ان دنیاؤں کے باسیوں کی ذہنی، فکری، سماجی اور معاشی حالت میں اُتنا ہی فرق موجود ہے جتنا ریاستہائے متحدہ امریکہ اور تنزانیہ کی ترقی کا فرق ہوسکتا ہے۔ اسی فرق کی بناء پر ہونے والی مصنوعی تہذیبی تبدیلی سے وابستہ اہم سماجی تصورات نے کس طرح انسانی سوچ کو متاثر کیا ہے اور تیسری دنیا کے کم تعلیم یافتہ اور ان پڑھ انسان نے اِس تصور کو کس انداز میں سمجھا ہے۔ اس کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہوگا کہ تیسری دنیا کی اصطلاح کی تعریف کا بھی تعین کر لیا جائے تاکہ بحث کو آگے بڑھانے اور تفہیم میں آسانی پیدا ہو سکے۔

عہدِ عالمگیریت میں تیسری دنیا کی اصطلاح بذات خود کئی طرح کے مسائل کی حامل ہے کیونکہ دنیا کے انسانوں کو معاشی ترقی کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا ہے اور تیسری دنیا کی اصطلاح بنتے ہی توجہ افریقہ، ایشیاء، لاطینی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے غریب ممالک اور ان کے باشندوں کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ جبکہ ۱۹۹۰ء سے پہلے سیاسی طور پر کرہ ارض پہلی دنیا (مغرب) دوسری دنیا (اشتراکی ممالک) اور تیسری دنیا (غیر وابستہ ممالک) میں تقسیم تھا۔ موجود دور میں شمال اور جنوب کی اصطلاح استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن تیسری دنیا سے مراد مندرجہ بالا براعظموں کے غریب، کم ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک ہیں۔ ان تیسری دنیا کے ممالک کے اندر بھی ایک تقسیم موجود ہے۔ جس کی بنیادی وجہ تیل کی پیداوار اور نئے اُبھرتے ہوئے صنعتی ممالک NICS (Newly Emerging Industrialized Countries) ہیں۔ ورلڈ بینک نے ''کم آمدنی والی'' چوتھی دنیا بھی دریافت کی ہے۔ مثلاً بنگلہ دیش اور تنزانیہ اس دنیا میں شامل ہیں اور متوسط آمدنی والے ممالک میں میکسیکو اور ملائیشیا وغیرہ شامل ہیں۔ تقسیم کا پیمانہ خواہ کوئی بھی مقرر کر لیا جائے۔ تیسری دنیا کے غریب ممالک میں غربت انسانی وسائل کا استعمال، نو آبادیاتی نظام کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر انداز ہونا اور نوآبادیاتی نظام کی باقیات قدر مشترک ہیں۔ ان کے اثرات ان ممالک کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان اثرات کے نتیجے میں تیسری دنیا کے سب سے اہم مسائل غربت، بے روزگاری، سہولیات زندگی کی کمی، قومی شناخت کا بحران، عالمی مالیاتی نظام کی تشکیل نو اور اس میں تیسری دنیا کا کردار ہیں۔ اس عالمگیریت کے تصور کے نفاذ سے وابستہ سماجی تبدیلی نے تیسری دنیا کے مسائل کو مزید پیچیدہ اور گنجلک بنا دیا ہے اور تیسری دنیا کے ممالک کے تمام شعبہ ہائے زندگی اِس عالمگیریت کے مغربی تصور سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ان میں اصلاح کی بجائے خرابی کا عنصر نمایاں ہے۔

کئی عالمی ماہرین معاشیات کا خیال ہے کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں تبدیلی ''پیداوار کے ذرائع'' میں ہوئی ہے کیونکہ گزشتہ چند دہائیوں میں تمام دنیا کی معیشت کا مرکز و محور ''زراعت اور صنعت و حرفت''

تھی جبکہ موجودہ عہد کو کمپیوٹر ٹیکنالوجی، اطلاعات اور افرادی قوت کا عہد کہا جا رہا ہے۔ اسی لئے موجودہ انسانی معاشرہ ''علمی معاشرے اور انسانی خدمات کی معیشت'' میں ڈھل رہا ہے۔ جس کا انحصار جدید سائنسی تعلیم اور ٹیکنالوجی پر ہے۔ یہی سائنسی تعلیم اور ٹیکنالوجی عالمگیریت کے تصور کی بنیاد اور پھیلاؤ کا اہم سبب ہے۔ جسے پہلی دنیا (مغرب) اپنے حق میں استعمال کر کے تیسری دنیا کے مادی اور انسانی وسائل کو اپنے تصرف میں لا کر مزید آگے بڑھنے کا منصوبہ رکھتی ہے۔ دونوں دنیاؤں (مغرب اور تیسری دنیا میں فرق یہی سائنسی تعلیم اور ٹیکنالوجی ہے، جسے مغرب نے تیسری دنیا کے وسائل پر حاصل تصرف سے پچھلی دو صدیوں میں ترقی دی ہے۔ جبکہ اسکے برعکس غریب ممالک کی مصنوعات اور برآمدات کا انحصار زرعی خام مال پر ہے اور درآمدات تیار شدہ جدید مصنوعات پر مبنی ہیں جن کی ٹیکنالوجی کی منتقلی اور صنعتوں کے قیام کے لئے وسیع سرمایہ کاری کی ضرورت ہے جو غریب ممالک کے لئے اپنے وسائل سے ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کی معیشتیں ہر سال عدم توازن ادائیگی کے مسئلے سے دوچار ہیں اور بجٹ کا ایک بہت بڑا حصہ پہلی دنیا کے قرض کی سود کی نذر ہو جاتا ہے۔ تیسری دنیا کی افرادی قوت کو ذہنی اور فکری سطح پر پسماندہ رکھ کر معیشت کی ترقی پر بالواسطہ طور پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسری طرف غریب ممالک کے ذہین افراد کو عالمی معاشرے کے قیام میں اپنا حصہ ڈالنے کے لئے (Brain Drain) کے ذریعے مغرب درآمد کر کے اپنی ترقی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ تیسری دنیا کی معیشت کا انحصار زراعت کی برآمدات اور انفرادی قوت پر ہے لیکن دونوں عناصر کے معاملے میں مغرب کا رویہ امتیازی ہے۔ عالمی تجارتی ادارے (W.T.O - World Trade Organization) کا فروری ۲۰۰۳ء ٹوکیو میں ہونے والا اجلاس محض اس لئے تعطل کا شکار ہو گیا کہ پہلی دنیا کے امیر ممالک زرعی مصنوعات کی برآمدات پر سب سڈی (Subsidy) دینے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ ظاہر ہے اِس ساری صورتحال کا مطمع نظر صرف ''دنیا کی دولت کو سمیٹنا ہے۔'' غیر وابستہ ممالک کی تیرہویں سربراہی کانفرنس میں ملائیشیا کے وزیراعظم (سابق) مہاتیر محمد کو کہنا پڑا کہ ''عالمگیریت کو صرف دولت کے تصرف تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔'' (وارائنڈ گلوبلائزیشن، روزنامہ ڈان فروری ۲۸، ۲۰۰۳ء) تیسری دنیا اور عالمگیریت سے متعلق دوسرا اہم معاشی نظریہ ''موخر سرمایہ داری نظام'' (Late Capitalism) ہے۔ جس کے بارے میں مارکسی نقطہ نظر یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں سرمایہ داری نظام کے طریقہ ہائے عمل اور اداروں میں اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں اور دولت اکٹھی کرنے کا انحصار اعداد و شمار، اشتہارات اور اطلاعات پر ہو گیا۔ اس نظام نے ایک طرف عالمی مالیاتی اداروں کو فروغ دیا ہے تو دوسری طرف نیا سامراجی نظام (NEOImperialism) اور تیسری دنیا کا خود ساختہ نظام بھی پیدا کیا ہے۔ اِسی موخر سرمایہ داری نظام کے تحت معرض وجود میں آنے والے معاشی ڈھانچے نے سماجی نظام میں بھی تبدیلی کا عمل شروع کر رکھا ہے۔

سماجی تبدیلی نے ایک طرف عام آدمی کی ذہنی سطح اور صلاحیت کو میڈیا کے ذریعے متاثر کیا ہے

تو علمی و ادبی حلقوں میں ''مابعد جدیدیت'' (Post-Modernism) کی اصطلاح رائج کی گئی ہے۔ مابعد جدیدیت کا یہ تصور انسان کو ایک ایسے بحران کی طرف لے جاتا ہے جس میں وہ سوچتا ہے کہ انسانیت، جدیدیت سے اگلے عہد میں داخل ہوگئی ہے اور انسانی معاشرہ ایسے عہد میں زندہ ہے جس میں مابعد جدیدیت نے تمام بنیادی تصورات اور نظریات کو باطل ثابت کر دیا ہے۔ وہ بنیادی تصورات اور نظریات جو انسانی علم نے کائنات کی سچائیوں کو پرکھنے اور پانے کے لئے تشکیل دیئے ہیں۔ اِس نظریہ مابعد جدیدیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اِس کے زیرِ اثر فرد ہم عصر معاشرے میں اپنی ''شناخت'' (Identity) کے سوال سے دو چار ہے۔ یہ شکستہ ذات (Fractured-Self) انسان ہے جو کئی طرح کے احساسات اور خیالات کی کئی سطحوں پر اُلجھا ہوا ہے۔ یہی اُلجھاؤ عالمگیریت کا وہ منفی پہلو ہے جو مغرب نے خوش کن اور دلفریب مباحث کے نیچے دفن کر رکھا ہے تاکہ تیسری دنیا کا شکستہ ذات ادیب اور دانشور مابعد جدیدیت میں اُلجھ کر اپنے لوگوں کے مسائل کا حل تلاش نہ کر سکے۔ عالمگیریت سے وابستہ مابعد جدیدیت کے عہد میں کرۂ ارض اشیائے صارفین کی منڈی ہے جس میں انسان اُس کی سوچ اور پیداوار سب کچھ ''کچھ انسانوں کو'' سب کچھ مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔

مغرب کی مابعد جدیدیت تک رسائی کئی عوامل کا نتیجہ ہے جن میں تعلیم اور معیشت کے بعد نظام حکومت کی تبدیلی بھی اہم عامل ہے۔ اِس تبدیلی میں بادشاہت اور آمریت کے نظام کے بعد جمہوری نظام حکومت کا قیام شامل ہے۔ عالمگیریت کے عہد میں مغرب نے جمہوریت اور جمہوری اقدار کے پھیلاؤ اور تسلسل کو اہم مقام دے رکھا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تیسری دُنیا میں جمہوری نظام اور جمہوریت کا تصور مغربی سامراجی طاقتوں نے اپنے نوآبادیاتی عہد میں متعارف کروایا۔ اِس جمہوری نظام اور جمہوریت کو نوآبادیاتی طاقتوں نے اپنے قبضے کو توسیع دینے کا ذریعہ بنایا۔ ان کے انخلاء کے بعد بھی تیسری دنیا میں یہ نظام صحیح خطوط پر قائم نہ ہو سکا جس کی اہم وجہ مغربی دنیا کا تیسری دنیا میں ''جبر کی قوتوں'' اور ''عوام دشمن قوتوں'' کو مضبوط کرنا ہے۔ اسکے علاوہ ان قوتوں کے ذریعے سیاسی اداروں کو کمزور کرنے، انتشار اور افراتفری کو فروغ دے کر جمہوری اقدار و روایات آئینی بالادستی اور جمہوری سیاسی قوتوں کو پروان نہ چڑھنے دینا ہے کیونکہ جمہوری اقدار و روایات اور نظام کا استحکام اور ترقی براہِ راست عوامی فلاحی ریاست کے قیام پر منتج ہوتی ہے۔ مغربی دنیا نے عالمگیریت کے تصور کو اپنے مفادات کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا ہے جس کی مثال جمہوریت کے فقدان کو بہانہ بنا کر تیسری دنیا کے ممالک پر معاشی و تجارتی پابندیاں عائد کرنا ہے تاکہ اپنے مالیاتی مفادات کا تحفظ ممکن ہو سکے۔ مہاتیر محمد نے اسی طرف واضح الفاظ میں اشارہ کیا ہے ''اب ہمیں صرف ایک جمہوری نظام حکومت کی اجازت ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب سے بہترین نظام ہے لیکن جمہوریت کے قیام کے لیے لوگوں کو قحط میں مبتلا کرنا، ادویات پر پابندی عائد کرنا، کہاں تک جمہوری ہے۔ درحقیقت اس کے نتیجے میں لاکھوں لوگ موت کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں کیوں کہ انہوں نے اِس نئے مذہب کو اختیار نہیں کیا اور لاکھوں مشکلات کا شکار ہیں کیوں کہ انتشار اور افراتفری کے نتیجے میں وہ جمہوریت کو پروان نہیں چڑھا سکے۔'' (وار اینڈ گلوبلائزیشن، روزنامہ ڈان، فروری ۲۸، ۲۰۰۳ء)

اس افراتفری اور انتشار کی سرپرستی نے تیسری دُنیا میں جمہوری اداروں اور جمہوری رویوں کو مضبوط نہ ہونے دیا جس کے نتیجے میں شخصیت پرستی، مذہبی انتہا پسندی اور عدم برداشت کے رویوں نے انتہا پسندی اور دہشت گردی کو فروغ دیا ہے۔ اسی انتہا پسندی اور دہشت گردی کو مغرب نے (خصوصاً امریکہ) دُنیا کے مختلف ممالک (افغانستان اور نکاراگوا وغیرہ) میں اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا اور دُنیا میں دو قطبی نظام (Bi-polar System) کے خاتمے کے بعد اپنے پروردہ دہشت گردوں کو ناپسندیدہ عناصر قرار دے کر (Unipolar System) میں اپنی برتری کے لیے تیسری دُنیا کے غریب عوام کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بہانہ بنا کر مزید سماجی و معاشی مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔ بقول نوم چومسکی امریکہ نے نکاراگوا کے باغیوں کی حمایت اس لیے کی کیوں کہ وہاں کی جمہوری حکومت امریکی مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتی تھی۔

عالمگیریت کے تصور کو جان بوجھ کر تاریخ کے خاتمے سے منسلک کرنے کی شعوری کوشش نے اہم بحث کو جنم دیا جب ۱۹۹۰ء کے عشرہ میں یورپ کی اشتراکی جمہوریتوں کے خاتمے اور سقوطِ سوویت یونین کے بعد امریکہ کے دفتر خارجہ کے ایک اعلیٰ عہدے دار فوکویاما (Fukuyama) نے ۱۹۹۲ء میں شائع شدہ اپنے مضمون میں اشتراکی جمہوریتوں کے خاتمے کو لبرل ڈیموکریسی کی جیت قرار دیا اور لکھا کہ اس جیت نے تمام طرح کے تاریخی اختلافات اور سماجی ارتقاء کے نظریات کو ختم کر دیا ہے۔ اس شعوری کوشش کا بنیادی مقصد تیسری دنیا کو یہ تاثر دینا تھا کہ قومی شناخت تہذیبی و ثقافتی ورثہ اور تاریخی و سیاسی شعور پیدا کرنے کی بجائے عالمی طاقتوں کے مفادات کا تحفظ ہی ان کی بقاء اور فلاح کا ذریعہ ہے۔

عالمگیریت کا تصور بلاشبہ اپنے اندر مثبت اور منفی پہلو رکھتا ہے اور تیسری دُنیا کو ان دونوں پہلوؤں کا بغور جائزہ لینے کے بعد اپنی ترقی کی سمت کا تعین کرنا ہوگا۔ سمت کے تعین میں دانشور طبقہ کی سب سے اہم ذمہ داری اپنے عوام اور حکومت کو عالمگیریت کے مغربی تصور کو من و عن ماننے اور پیروی کرنے کے اثرات سے آگاہ کرنا ہے۔ تیسری دُنیا کا دانشور اس مغرب کے ۱۶ ویں صدی کے عہد کے دانشور کی طرح آمریت، بادشاہت، جاگیرداری اور توہماتی عقائد کے معاشروں میں زندہ ہے۔ اُسے اِن تمام برائیوں سے نجات کے لیے کوئی واضح لائحہ عمل تشکیل دینا ہے تاکہ اُس کے غریب پسے ہوئے انسانوں کو بھی عالمگیریت کے ثمرات مل سکیں۔

سب سے پہلے تو تیسری دُنیا کے دانشور کو کسی قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی بجائے خود اعتمادی سے سوچنا چاہیے کہ عہد عالمگیریت تک انسان کو لانا صرف مغرب کی دانش اور محنت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ کرۂ ارض پر بسنے والی بنی نوع انسان کی صدیوں کی دانش و محنت کا نقطۂ عروج ہے۔ لہٰذا مغرب کا غریب ممالک پر کسی تہذیبی تبدیلی کا عمل مسلّط کرنا غیر فطری اور غیر جمہوری عمل ہے کیوں کہ اس عمل کے پس پردہ محرکات صریحاً ان ممالک میں ایسی ثقافتی و تہذیبی فضا قائم کرنا ہے جو مغربی تجارتی اداروں کی اشیاء کی منڈی بن سکیں۔ یہ تہذیبی تبدیلی کا غیر فطری عمل اپنے اندر خارجی اور داخلی سطح پر کئی اہم اثرات کا حامل ہے۔ خارجی سطح پر اس کے اثرات بڑے مثبت نظر آتے ہیں اور تیسری دُنیا کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ عالمی انسانی معاشرے کا قیام کرۂ ارض سے سرحدوں اور فاصلوں کو ختم کر دے گا۔ تیسری دُنیا کا دانشور

اسے ثقافتی وتہذیبی تبدیلی کا عمل کہہ کر انسانی تہذیب کے ارتقاء کا عمل سمجھ کر مطمئن ہو جائے تو یہ تاریخی مغالطے سے کم نہ ہوگا کیونکہ داخلی طور پر تہذیبی تبدیلی کا یہ عمل تیسری دنیا کے غریب ممالک کو ان کی قومی ثقافتی وتہذیبی پہچان سے محروم کر دے گا۔ اس محرومی کے بعد نیا سامراجی نظام اپنا تہذیبی تبدیلی کا ایجنڈا ان پر مسلّط کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس وقت تیسری دُنیا اِس مصنوعی تہذیبی تبدیلی کے زیر اثر اپنے ہاتھوں اپنے تہذیبی وثقافتی ورثہ کو تباہ کر رہی ہے۔ اس تہذیبی تبدیلی کی یلغار میں جنم لینے والے فکری میلانات اور فکری وذہنی سطح پر فرد سے سماج تک کے ذہنی ارتقاء کا تجزیہ یہ ثابت کر دیتا ہے کہ تیسری دُنیا میں سیاست، امور حکومت، معیشت، مذہب، ادب اور معاشرے سے منسلک تمام ادارے شدید ترین احساسِ تنہائی اور بیگانگی کا شکار ہیں۔ ہر ادارہ انفرادی طور پر اپنے بقاء کی جنگ لڑنے میں مصروف ہے۔ اس سے قطع نظر کہ دوسروں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اس تہذیبی تبدیلی نے غریب ممالک کے تمام انسانوں کو خوف اور بداعتمادی کا شکار بنا دیا ہے۔ ان حالات میں تیسری دُنیا کے دانشور کی ذمہ داری میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اُسے اپنے ہم عصر انسانوں کو مابعد جدیدیت کے شکستہ ذات انسان کی سطح سے نکال واضح نصب العین دینا ہوگا کیوں کہ تیسری دُنیا بلاشبہ وسائل کی کمی کے باعث پہلی دُنیا (مغرب) کا براہِ راست مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ کروڑوں انسانوں کو مصنوعی تہذیبی تبدیلی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مغربی تجارتی ایجنڈے کی نذر کر دیا جائے۔

تیسری دُنیا کے یہ کروڑوں انسان ہی اس کی سب سے بڑی دولت اور قوت ہیں۔ جو کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں اپنے مخصوص جغرافیائی، تاریخی، سماجی ومعاشی پس منظر اور معروض میں زندہ ہیں۔ اِس تنوع کے باوجود خوش آئند حقیقت یہ ہے کہ سب کو نوآبادیاتی باقیات اور نظام کے اثرات کا سامنا ہے اور یہی حقیقت ان ممالک کے انسانوں کو اکٹھا کرنے کا سبب بن سکتی ہے اگر ہم انہیں یہ سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں کہ وہ کتنے اہم ہیں اور عہد عالمگیریت میں ان کا کیا کردار ہے۔

یقیناً ہم (تیسری دُنیا) عالمگیریت کے عمل سے لاتعلق نہیں رہ سکتے اور نہ ہی ہم کسی قنوطیت پسندی کا شکار ہیں۔ نہ ہی ہمیں طویل عرصے تک ذہنی انتشار میں مبتلا کیا جا سکتا ہے۔ ہم (تیسری دُنیا) عالمگیریت کا اپنا خاص تصور رکھتے ہیں۔ ایک ایسی دُنیا تعمیر کرنے کا تصور جس میں عالمگیریت صرف دولت سمیٹنے کا ذریعہ نہیں ہوگی بلکہ اس کا بنیادی مقصد زیادہ سے زیادہ وسائل کی مساوی تقسیم، سماجی ومعاشی انصاف ہوگا۔ ہماری یہ دُنیا صدیوں سے قائم توہماتی عقائد سے پاک ہوگی ایسے عقائد جن کی بنیاد پر انسان صدیوں سے لقمہ اجل بنائے جا رہے ہیں۔ ہماری اس دُنیا کی ترقی کا انحصار سائنسی وسماجی علوم کے فروغ اور ان کا استعمال انسانی فلاح و بہبود کے لیے ہوگا۔ عالمگیریت کے اِس تصور (Vision) کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک موثر طریقہ ہائے کار (Effective Modus Operandi) کی ضرورت ہے جس کے لیے تیسری دُنیا کو

حکومتی اور عوامی دونوں سطحوں پر کام کرنا ہوگا اور ایسی حکمت عملی وضع کرنا ہوگی جس میں نیا سامراجی نظام تیسری دُنیا پر مسلّط ہونے سے بچا جا سکے۔ حکومتی سطح پر ایسے تجارتی عالمی اداروں کا قیام ممکن بنانا ہوگا جو ۲۰۰۵ء میں نافذ ہونے والے عالمی تجارتی ادارے (W.T.O) کے معاہدے میں فری مارکیٹ اکانومی میں غریب ممالک کے معاشی حقوق کے تحفظ کے لیے عملی اور موثر کام کر سکیں۔ داخلی طور پر حکمرانوں اور دانشوروں کو اپنی سب سے قیمتی دولت ''افرادی قوت'' کی صحیح خطوط پر تربیت کرنا ہوگی۔ اس سلسلے میں ورلڈ بینک اور مغربی مالیاتی اداروں کی شرائط پر تعلیمی پالیسی کی تشکیل اور ان کی پسند کے مضامین کی ترویج کی بجائے اپنے معروضی حالات میں تعلیمی ترقی اور ذہنی وفکری تربیت کی ضرورت ہے۔ مثلاً پاکستان میں عمرانی اور سماجی علوم کی قیمت پر سائنسی تعلیم کا فروغ معاشرے سے منطق، سیاسی وسماجی شعور کے خاتمے کا سبب بن رہا ہے۔ یہ عمرانی اور سماجی علوم کی ترقی سائنسی وتکنیکی علوم کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیے کیوں کہ یہی عمرانی وسماجی علوم سائنسی شعور، سیاسی سوجھ بوجھ کا سبب بنتے ہیں۔ مغرب نے جہاں سائنسی سوچ کو پروان چڑھایا وہاں سماجی وعمرانی علوم نے آمریت اور مطلق العنانیت کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور ''مغربی معاشروں'' کو جمہوریت، جمہوری اقدار اور رواداری کے اُصولوں سے مزین کیا جن کا آج تیسری دُنیا میں فقدان ہے۔

تیسری دُنیا کے دانشور کو عالمگیریت کے عہد میں میسر وسائل اطلاعات وذرائع ابلاغ کے بھرپور استعمال سے اپنے ہم عصر انسانوں کو آمریت، عوام دشمن قوتوں، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے گٹھ جوڑ سے آگاہ کرنا ہوگا اور انہیں بتانا ہوگا کہ یہ سب ''جبر کی قوتیں'' اور ''عوام دشمن قوتیں'' ہیں جن کا بنیادی مقصد صرف اور صرف مغربی مفادات کے تحفظ کے لیے کام کرنا ہے۔ اس سارے عمل میں اہم ترین عامل تیسری دُنیا کا انسان ہے جسے اُس کے دانشور نے شکستہ ذات (Fractured-self) ہونے سے بچانا ہے تاکہ وہ مصنوعی تہذیبی تبدیلی میں آلہ کار بننے کی بجائے اپنی قومی شناخت اور قومی ترقی میں معاون ہو۔

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جب کوئی تہذیب عروج حاصل کر لیتی ہے تو فطری طور پر اپنی طاقت کا اظہار چاہتی ہے۔ ایسی ہی صورت حال کا سامنا اِس عہد عالمگیریت میں مغربی تہذیب کو ہے جو تہذیبی وتجارتی طور پر تیسری دُنیا پر مسلّط ہونا چاہتی ہے لیکن اِس علمی اور افرادی قوت کے عہد میں ایسا ممکن نہیں ہے کہ محض طاقت کے بل بوتے پر انسانی حقوق کو روند دیا جائے۔ اس کی مزاحمت خود مغربی معاشروں کے باضمیر انسان کر رہے ہیں۔ تیسری دُنیا کو اپنا رابطہ انسانی سطح پر بڑھانا ہوگا۔ انسانی سطح سے مراد عوام ہیں کیوں کہ دُنیا کے کسی بھی حصے میں عوام کی اکثریت حکومتی فیصلوں سے قطع نظر انسانیت کی فلاح چاہتی ہے۔ بقول نوبیل انعام یافتہ ڈیسمنڈ ٹوٹو دُنیا کی زیادہ تر حکومتیں عوام کی سوچ کی نمائندگی نہیں کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کے چند انسان تمام کرۂ ارض پر قابض ہونا چاہتے ہیں جو یقیناً غیر فطری اور غیر جمہوری عمل ہے۔ تیسری دُنیا کو اس عہد عالمگیریت میں جمہوری آدرشوں کو پروان چڑھانا ہے تاکہ عالمگیریت کا فلاحی اور انسانی تصور پھیل سکے۔

محمد حامد سراج

ناولاتی تخلیقیت کا قطبی ستارہ

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر شارب ردولوی کا کہنا ہے۔۔۔''ناول کو زندگی کا رزمیہ کہا گیا ہے۔ یہ ایک دلچسپ صنف بھی ہے اور دشوار بھی۔۔۔ دلچسپ اس لئے کہ اس میں ہر عہد اپنی تمام رعنائیوں، پیچیدگیوں اور کلفتوں کے ساتھ رواں نظر آتا ہے۔ یہ ایک طرف اپنے زمانے کی تہذیبی وثقافتی سماجی اور تاریخی قدروں کا عکاس ہوتا ہے دوسری طرف یہ شعور احساس اور آگہی کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ ناول دشوار صنف اس لئے ہے کہ زندگی کی بہت تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی اقدار کا ساتھ دینا اور ان قدروں سے ناول کو ہم آہنگ رکھنا نہ آسان ہے اور نہ ہر ایک کے بس کا کام۔۔۔''

شاداب ردولوی کے اس آئینے میں اگر اُردو ناول نگاری کی تاریخ کا عمیق جائزہ لیا جائے تو کلاسیکی ناول انگلیوں پر شمار کئے جاسکتے ہیں اُردو افسانے کی صدی مکمل ہونے پر یہ ایقان سے کہا جاسکتا ہے کہ افسانہ مغربی Fiction پر فائق ہے لیکن ناول کے حوالے سے ہم ابھی اس سٹینڈ پر کھڑے نہیں ہوسکے جہاں مغربی کلاسیکی ناول کھڑا ہے۔ موازنہ کرنے کے لئے نام گنوانا اس لئے ضروری نہیں سمجھتا کہ ادب کے قاری اور نقاد کی بصیرت سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ قرۃ العین حیدر کا آگ کا دریا، عبداللہ حسین کا اداس نسلیں، بانو قدسیہ کا راجہ گدھ، انتظار حسین کا بستی، احمد داؤد کا رہائی، جمیلہ ہاشمی کا تلاشِ بہاراں، جوگندر پال کا بیانات، حسین الحق کا فرات، راجندر سنگھ بیدی کا اک چادر میلی سی، شوکت صدیقی کا خدا کی بستی، عبدالصمد کا مہاتما، غلام الثقلین نقوی کا میرا گاؤں اور ان داتا، مستنصر حسین تارڑ کا بہاؤ اور ''راکھ''۔ ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی، خالدہ حسین کا کاغذی گھاٹ اور ڈاکٹر وحید احمد کا زینو۔۔۔ ایسے ناول ہیں جنہوں نے اُردو ناول نگاری کو نہ صرف ثمر بار کیا ہے بلکہ اُردو زبان کو عالمی کلاسیکی ناول کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے چوتھے سال میں میرے سامنے ایک ناول ہے جو سرزمین ہند سے مشرف عالم ذوقی نے مجھے بھجوایا ہے۔ ناول کے عنوان نے مجھے چونکایا۔۔۔''پوکے مان کی دنیا''۔۔۔ یہ ناول نگار کس دنیا کی بات کرنا چاہتا ہے۔۔۔؟ کیا وہ اسی زمین کا دکھ اور عذاب Paint کرنا چاہتا ہے یا اس نے تخیلاتی تحریر سے قاری کو اسیر کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔؟ کیا یہ ایک ناول ہے صرف ناول یا ناول نگار نے اُردو ناول کی تاریخ کو نئے اینگل سے فتح کیا ہے؟ یہی وہ نقطہ تھا کہ میں نے ناول کا دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھا۔۔۔ اور پھر واپسی کا رستہ بھول گیا۔ میں کسی اور جہان میں جا نکلا، تحیر اور خوف کے ساتھ ساتھ اس زمین پر ہونے والی نسلیاتی تبدیلیوں نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ ناول ایسے وقت میں منظر عام پر آیا ہے جب دنیا کی کیمسٹری بدل رہی ہے۔ تاریخ بذاتِ خود اپنے بارے مستقبل کے

فیصلے سے خائف ہے۔ کرۂ ارض کے کمزور ممالک پر ترقی یافتہ ممالک کی بارودی یلغار نے انسان کو بے یقینی کی ایسی سرحد پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے کوئی راستہ سلامتی اور امن کو نہیں جاتا۔

اس حیرت انگیز ناول میں ناول نگاری کی فکری سطح کی ذہین لہریں آپ کو ایک نئے جہانِ معنی میں لے جائیں گی۔۔۔ ناول نگار کا کہنا ہے:

> ''مجھے ہنسی آتی ہے۔ مارس پر پانی ہے تو سائنس دان وہاں پائے جانے والی زندگی کے بارے مطمئن ہو جاتے ہیں اور یہاں زمین پر۔۔۔ یہ اُجلا شفاف پانی۔۔۔ جو ہر دن گزرنے کے ساتھ سرخ پانی میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔۔۔''

تین سو چھتیس صفحات کے اس ناول کے مطالعے سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا ایک بڑا اور منفرد ناول ہے۔ یہ جدید منظر نامے اور کرۂ ارض پر تیزی سے زوال پذیر ہوتی ہوئی تاریخی اور تہذیبی روایت کا نوحہ ہے۔ ناول کا بنیادی Theme اس زمین پر بسنے والی نئی نسل کے بگاڑ اور ذہنی انحطاط کا Operation ہے۔ قلم کار کی مہارت بھی سرجن کی طرح نہ ہو تو تخلیق وقت کے Operation Table پر دم توڑ دیتی ہے۔ اس فن پارے میں ذوقی کے ہاتھ میں جو نشتر ہے اس سے اس نے ایسی مہارت کے ساتھ حالات، واقعات اور مسائل کا Operation کیا ہے کہ آنے والے وقت میں اُردو ادب کی تاریخ اس سرجن کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔

سوال یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے ہمیں کیا دیا ہے۔۔۔؟ ہم سے ہماری روایات اور تہذیب تک چھین لی۔۔۔ انٹرنیٹ، کیبل اور ڈش پر پروان چڑھنے والی نسل کے اذہان میں جو جنسی اور جنگی پیوند کاری کی گئی ہے۔ وہ اس ناول کا بنیادی نقطہ ہے اور ناول نگار کے اس نقطے پر ارتکاز نے اس ناول کو کلاسیکی ادب کا شہکار بنا دیا ہے۔ اس کہانی میں ایک بارہ سال کا بچہ Rape Case میں ملوث پایا جاتا ہے۔ اسی سوال کو اہمیت دیتے ہوئے سوالات نے جنم لیا۔۔۔!

> بچوں کے ساتھ ریپ کے قصے امریکہ سے ہندوستان تک عام ہیں۔
> ہزاروں قصے۔۔۔ مگر جب ریپ کرنے والا ایک بچہ ہو۔
> میڈیکل سائنس کیا کہتی ہے۔۔۔؟
> کیا بارہ سال کا ایک بچہ۔۔۔؟
> کیا بچے کو مجرم ٹھہرایا جائے گا۔۔۔ یا۔۔۔ معاشرے کو۔۔۔؟ معاشرہ جس نے ایک معصوم ذہن کو کچی عمر میں ایک پختہ مرد کی جنسی سوچ Inject کی۔۔۔ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے کرۂ ارض کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ شرم وحیا جو مشرقی زیور تھا، قصۂ پارینہ ہوا۔۔۔ یہ گلیمر کی دنیا ہے۔۔۔ چند روزہ زندگی میں لذت کشید کرو۔۔۔ عیش کرو۔۔۔ کیا اسی کا نام زندگی ہے۔۔۔؟ کیا واقعی معاشرہ مجرم ہے۔۔۔؟ ناول نگار کا یہ کہنا بجا ہے۔

''کرائم کے لئے بچے کا کوئی انٹینشن نہیں تھا۔ اس لئے اگر جیل بھیجنا ہے تو معاشرے کو بھیجئے۔۔۔ سزا دینی ہے تو ہمارے گلے سڑے کلچر کو دیجئے۔ جرم کا طوق گلے میں ڈالنا ہے تو ٹی وی پر ڈالیے۔۔۔ تیزی سے اپرادھی بنانے Perversion کو موردِ الزام ٹھہرایئے۔۔۔ صرف ۔۔۔ It has been excuted کہنے سے معاملہ نہیں بنتا۔۔۔!''

امریکی یلغار نے پوری دنیا کی تہذیبوں کو زہر آلود کیا ہے۔۔۔ آلِ کولمبس نے جہاں پانی کا رنگ سرخ کر دیا ہے وہاں اس نے اپنی ریشہ دوانیوں سے اقوامِ عالم کے احساسات کو بھی کچلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔۔۔ وہ ہر حربہ استعمال کرنا فرضِ عین سمجھتے ہیں۔۔۔ ناول نگار کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب بھی اسی لپیٹ میں آ کر اپنا تشخص کھو بیٹھی ہے۔۔۔ ''تنن'' چند بنیادی کرداروں میں سے ایک ہے۔ وہ اپنے باپ سے کہتا ہے۔

آپ نہیں سمجھو گے ڈیڈ۔ اب آپ کو کیسے سمجھاؤں۔۔۔؟ کسی دن آؤ تو سر سے ملاؤں۔۔۔ انڈیا میں ہم نے امریکہ بنا رکھا ہے۔

بلیو برڈ امریکہ ہے۔۔۔ اندر جاتے ہی انڈیا سے ہمارا رابطہ ختم ہو جاتا ہے اور ہم امریکہ میں ہوتے ہیں۔

ہم انٹرنیٹ پر امریکہ کو مطمئن کرتے ہیں کہ وہ انڈیا کے کسی حصے میں نہیں۔۔۔ ان کے دلوں میں۔۔۔ ان کے موسم کا حال جانتے ہیں۔

ان کی قسمت پر فخر کرتے ہوئے۔۔۔

دراصل تم انہیں فول بناتے ہو

''ہاں۔۔۔ جیسے بش سای دنیا کو فول بنا رہا ہے''

پتہ نہیں۔۔۔

تو یہی تمہارا بلیو برڈ ہے۔۔۔!

ناول نگار نے اپنے قلم سے اتنا عمیق جائزہ لیا ہے کہ جزیات تک کو نظر انداز نہیں کیا۔۔۔ پوری دنیا میں بچے کارٹون بڑے شوق اور انہماک سے دیکھتے ہیں۔ ڈش اور کیبل نیٹ ورک پر کارٹونز کا الگ چینل ہے جو چوبیس گھنٹے صرف کارٹون نشر کرتا ہے۔ بہت سے والدین کی سوچ کا ایک زاویہ یہ بھی ہے بچوں کو آوارہ گردی سے بچانے کے لئے گھر میں کارٹون دیکھنے کی اجازت دے دینی چاہیے تاکہ وہ لطف اندوز بھی ہوں اور آوارہ گردی کا بھی سدِ باب ہو سکے۔۔۔ اب ایک سوال سامنے ہتھیلی پھیلائے کھڑا اس دانش کی خیرات مانگ رہا ہے کہ کیا کارٹون بچوں کے اذہان میں تعمیری پیوند کاری کرتے ہیں یا۔۔۔ تخریبی۔۔۔؟

ذوقی کی دانش رقم طراز ہے۔۔۔۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ کارٹونوں نے بچوں کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا ہے۔ بچے اب پکاچو اور پو کے مان جیسے کرداروں کے ساتھ جیتے ہیں اگر آپ ان کے نام سے انجان ہیں، تو بچے آپ کے ماڈرن ہونے پر شک کر سکتے ہیں لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔ آپ اپنے بچوں کو صحت مند وطن دوست اور مہذب بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو انہیں کارٹونوں سے دور کرنا ہوگا۔

ریتا بھاوے نے ٹوکا۔۔۔

کیا آسان ہے۔۔۔؟ کیا آپ کر سکتے ہیں۔۔۔؟ بچے بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن روکنا تو ہوگا۔۔۔ پرما کی دلیل تھی۔

کارٹون میں کھوئے رہنے والے بچے اندر سے کھوکھلے ہو جائیں گے۔۔۔ بیمار بچے۔۔۔ کارٹون بچوں کی ذہنیت کو جرم کی طرف دھکیل رہا ہے۔۔۔ وہ بھی انجانے میں۔۔۔!

ول نگار کی اپنی دھرتی کا ساتھ محبت، یگانگت اور حب الوطنی کی سینکڑوں مثالیں موتیوں کی طرح ناول کے صفحات میں جگمگا رہی ہیں۔ وہ ایک مثالی، انسان دوست، جان پرسوز اور وفا کے پیکر کی صورت میں اپنی تحریر میں نمایاں ہے۔۔۔ ناول نگار ایک کھرا قلم کار ہے جو اپنی دھرتی کے زوال کے آثار وقت کی فصیل پر دیکھ کر آنے والے عہد میں اس طوفانِ بلا خیز کو روکنا چاہتا ہے۔۔۔ یاجوج ماجوج کی فوج جو اس کی دھرتی کو چاٹتی چلی جا رہی ہے۔۔۔ وہ اپنا کرب وقت کی ہتھیلی پر رکھے کہہ رہا ہے۔۔۔

''سروے کیجئے۔ اپنے گھر کے آس پاس کا۔۔۔ جائزہ لیجئے۔ کارٹون کا جادو بچوں کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ کمپیوٹر اور ویڈیو گیم میں بھی بچے اپنے پسندیدہ ہیروز کو دیکھنا چاہتے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے۔۔۔ بچے ہنسک بنتے جا رہے ہیں ان میں ظلم کرنے کی حسرت جاگ رہی ہے۔ وہ حکومت کرنا چاہتے ہین۔۔۔ اس لئے وہ پاور کی زبان جان چکے ہیں۔ بڑھتے ہوئے کارٹونوں کا یہ Negative Impact ہے۔۔۔ اور مسز ریتا بھاوے۔۔۔ میری جنگ اسی بات پر ہے دراصل باہر کے جو کارٹون ہمارے ملک میں آ رہے ہیں وہ ہر طرح سے ہمارے کلچر سے مختلف ہیں۔ ماحول، زبان اور تہذیب کا ایک بڑا فرق یہ بچے Dijest نہیں کر پائیں گے۔

Nudes اور Blue Print کا جنسی طوفان انٹرنیٹ اور CDs پر نسلِ انسانی کو تباہی کے آخری گڑھے پر لے آیا ہے۔۔۔ انسانی نفسیات اور شخصیت کو یہ کس طرح تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اس کے مضرات سے کس کو انکار ہے۔۔۔؟ کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلی معدوم نہیں ہو جاتی۔ NetCafe کی اوٹ میں رکھے کمپیوٹر کی سکرین پر نسلِ نو کیا دیکھتی ہے۔۔۔؟ گینگ ریپ اور انفرادی جنسی تعلقات

نے ہمیں کہاں لا کھڑا کیا ہے۔۔۔؟ برہنہ فلموں پر جنوری 1997ء میں رفیق احمد نقش کے ادبی جریدے ''تحریر۳'' میں حسن منظر کا مقالہ خاص۔۔۔ ''موجودہ معاشرہ اور برہنہ فلمیں'' ایک ایسا وقیع مضمون ہے جس میں اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اس طویل تجزیاتی مقالے میں وہ رقم طراز ہیں۔۔۔

ان Movies کی طلب اتنی بڑھ چکی ہے کہ جنسی نا آسودہ عورتیں اور جوانی کی دہلیز پر کھڑی لڑکیاں انہیں گھر اور محلے کے بچوں سے اسی طرح (لیکن روزانہ کہیں زیادہ تعداد میں) محلے کی ویڈیو کیسٹ کی دکان سے منگواتی ہیں جس طرح ایک زمانے میں پرائیویٹ لائبریریوں سے ''وَہی وَہانوی'' قسم کی کتابیں منگوا کر پڑھتی تھیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔ننگی فلموں سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے یہی حشر فیچر فلمیں بھی بپا کر چکی ہیں اور کر رہی ہیں۔اُردو، انگریزی، ہندی اور ہماری صوبائی سب ہی زبانوں کی۔۔۔ اور یہ سین تو عام ہے۔جس گھر میں بچے ویڈیو دیکھ رہے ہوں وہاں اگر ان کے بڑے آجائیں اور کوئی نیم برہنہ یا برہنہ سین شروع ہو جائے (یوروپین اور امریکی فلموں میں مع اپنی تمام تفاصیل کے) یا پردے پر ہو تو بچے فلم کو FastForward یا Freeze کر دیتے ہیں یا بڑے جھینپ کر خود ہی وہاں سے اُٹھ جاتے ہیں۔۔۔''

کم عمری کی جنسی جبلت کیا گل کھلاتی ہے۔۔۔؟ انٹرنیٹ اور کیبل اور CDs پر بلیو پرنٹ دیکھنے سے بچوں کی سائیکی کیا رُخ اختیار کرتی ہے۔۔۔ انٹرنیٹ پر ایسی سائیٹس بچوں کو Sexual Crimes کی طرف کس طرح اکساتی ہیں۔۔۔ ناول نگار کی باریک بینی ملاحظہ ہو:

> ''آن لائن پورنوگرافی۔۔۔ دنیا بھر میں 60 ہزار سے بھی زائد سائیٹس ایسی ہیں جو بچوں تک کو On Line پورنوگرافی سے تباہ کر رہے ہیں۔ان کا سب سے برا اثر معصوم بچوں پر پڑتا ہے۔جوانجانے میں ایسی سائیٹس کو Click کر دیتے ہیں اور تجسس ایسی سائیٹس کے لئے بڑھتا ہی جاتا ہے۔ظاہر ہے ایسے سائیٹس بچوں کو SexualCrimes کی طرف اکساتے ہیں۔۔۔''

ناول میں موجود کہانی جوں جوں آگے بڑھتی ہے۔۔۔ پردے اُٹھتے چلے جاتے ہیں۔۔۔ یہی سائبر کرائم ایک بارہ سالہ بچے کو بلادکار میں مبتلا کر دیتا ہے۔بچہ جیسے کارٹونوں کو ایک کھیل سمجھتا ہے اس کی معصوم فہم کے لئے ویڈیو گیمز کھیل کے زمرے میں آتے ہیں۔۔۔ ایسے ہی وہ Pornography کو بھی کھیل سمجھتا ہے۔۔۔ کھیلتے کھیلتے وہ اس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔۔۔ بات بلادکار سے بھی آگے جا نکلتی ہے۔۔۔ جنسی فلمیں دیکھنے سے بچوں کے اندر جو جسمانی بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں۔۔۔ ناول میں ان کی بھی پوری اور مکمل تفصیل ملتی ہے۔۔۔ یہ ناول نگار کے مشاہدے پر دال ہے۔!

''مہانگر میں ہر چھٹا بچہ بچی موٹاپے کا شکار ہے۔

پانچ میں سے دو بچے کولیسٹرول اور Diabetes کے بھی شکار ہیں۔

پانچ میں سے ایک بچہ SexualTension کے درمیان زندگی گزار رہا ہے۔

منتری جی فگر اور فیکٹ دیکھتے ہی چلا پڑے۔۔۔ دیکھئے کیا کہتے تھے ہم۔۔۔ یہ وہی بچے ہیں کیا۔۔۔؟ ہماری عمر والے۔۔۔ نہیں ہیں نا۔۔۔ ہم بچے تھے تو کاہم کو شوگر ہوتا تھا۔۔۔ کالیسٹرول ہوتا تھا۔۔۔ کاہم کو Tension پریشان کرتا تھا۔۔۔ ارے یہ سب۔۔۔ کا ہوتا ہے۔۔۔؟ ہم جانتے بھی نہیں تھے۔۔۔''

ناول نگار کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ SexualRelations کی عمر اب 20-18 سال سے کم ہو کر 14-12 سال تک پہنچ چکی ہے۔وہ دلیل لاتے ہوئے کہتے ہیں ''سماج کو اپنی ذہنیت بدلنی ہوگی۔بھول جانا ہوگا کہ بلاتکاری کی عمر کتنی ہے۔۔۔؟ کیوں کہ جو میڈیا ہمارے پاس ہیں اس نے بلاتکاری سے اس کی بڑی عمر چھین لی ہے۔اس معاملے میں سارے Evedence کسی خوبصورت صبح کی طرح صاف ہیں کوئی الجھن نہیں۔۔۔ اگر کوئی عمر ہے تو بلاتکاری کی عمر ہے۔۔۔''

اس ناول کا عنوان بے معنی اور تخیلاتی ہرگز نہیں۔۔۔ یہ ایک ایسی سفاک، خوفناک اور کٹیلی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔۔۔ پوکے مان کیا ہے۔۔۔ کیا صرف ایک کھیل ہے؟ نہیں بلکہ یہ تباہی کی طرف جاتا ایک ایسا راستہ ہے جو بالآخر معاشروں اور تہذیبوں کی موت پر منتج ہوتا ہے۔

''یہ جاننا ضروری ہے کہ پوکے مان ہے کیا۔۔۔؟ پوکے مان دراصل ان بچوں کی کہانی ہے جنہوں نے خرگوش، گلہری، یہاں تک کہ قینچی سے تعمیر کئے گئے ان کرداروں کو اپنا دوست بنایا ہوا ہے۔یہ سارے کردار پوکے مان کہلاتے ہیں اور ان کے انسانی دوستوں کو پاکے مان ٹرینر کہا جاتا ہے۔بچے اپنے اس یقین پر خوش ہیں کہ پوکے مان کا وجود ہے۔وہ ہر جگہ ہے دوست اور دشمن کی شکل میں۔۔۔ وہ لڑ سکتا ہے۔۔۔ Fight کر سکتا ہے۔دھماکہ کر سکتا ہے وہ برفیلے ملکوں میں رہتا ہے۔بچے پوکے مان بننا چاہتے ہیں۔کیوں کہ ان کے پاس Defence ہے۔۔۔ Confidence ہے۔۔۔ اب پوکے مان کے کرداروں کو دیکھئے ایک پوکے مان پکاچو ہے۔۔۔ دکھائی خرگوش کی طرح دیتا ہے، لیکن اس میں بجلی کا جھٹکا دینے کی طاقت ہے۔جنگلی پف۔۔۔ جس کا گانا سن کر سب لوگ سو جاتے ہیں پھر یہ مخلوق لوگوں کے چہرے پر اسکیچ پین سے تصویریں بناتا ہے۔سائیڈک۔۔۔ دماغی پوکے مان۔۔۔ جس کا سب کچھ دماغ ہے۔دماغ پر زور پڑتے ہی وہ طاقتور بن جاتا ہے۔کنگ سکھان۔۔۔ بھاری بھرکم پوکے مان۔۔۔ اچھل کود کر اچھے اچھوں کی چھٹی کر دیتا ہے۔اسکیٹی۔۔۔ اڑنے والی پوکے مان۔۔۔ جس کی پونچھ پر غبارہ بندھا ہے۔۔۔ کود کر حملہ کرتی ہے۔گیسلی۔۔۔ بال نما یہ مخلوق گیس کا حملہ کرتا ہیز ہر کا حملہ اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ایسے کتنے ہی پوکے مان ہیں۔۔۔ بچے مارکیٹ میں پوکے مان کے نئے نئے کھلونے ڈھونڈنے جاتے ہیں۔۔۔ ایک بہت بڑا بازار اور ہمارے بچے۔۔۔ باہر کی کمپنیوں کے لئے ہمارے

بچے آج سب سے بڑا ٹارگٹ ہیں۔۔۔جس کی آڑ لے کر تمام بڑی کمپنیاں اپنے اپنے Product ہماری مارکیٹ میں اتارنا چاہتی ہے۔۔۔مگر کس قیمت پر۔۔۔؟ میں گہری سوچ میں تھا۔اف۔۔۔۔مائی گاڈ زندگی۔۔۔پنج تتو، کے میل سے بنی ہے۔۔۔اور جاپانی کمپنی والوں نے آگ ہوا، اور پانی کو بھی نہیں چھوڑا۔۔۔چھوٹے چھوٹے کیکڑوں اور مچھروں کو بھی نہیں بخشا۔۔۔یہ ہے دماغ۔۔اس صدی کا بڑا دماغ دھول سے آسمان تک۔۔۔سب پوکے مان تخلیق کر دیے۔۔۔اور ان بچوں کے ذہن میں اپنا اپنا ایک الگ پوکے مان قائم کر دیا۔''

ناول میں کہانی کہنے کا انداز اتنا دل پذیر ہے کہ قاری مسحور ہو کر خود ناول کا ایک کردار ہو جاتا ہے۔۔۔وہ اپنی دنیا سے کٹ کر مکمل طور پر اس ناول میں گم ہو جاتا ہے۔وہ اس دنیا کو خوف اور تحیر سے دیکھتا ہے۔۔۔کیا یہ ہماری دنیا کی کہانی ہے۔۔۔؟ کیا یہ کسی اور سیارے کی مخلوق کی کہانی ہے۔۔۔؟ سوالات اس کے ذہن پر رینگتے ہیں۔۔۔یہ ایک ایسا ناول ہے جس کا دیانت دارانہ تجزیہ لکھنے کو ایک مکمل کتاب درکار ہے۔۔۔فن پارے میں دانش کا موجود ہونا بنیادی نقطہ ہے۔اس ناول میں فکری گہرائی اپنے عروج پر ہے۔۔۔مشہور ادیب اور نقاد ناصر عباس نیر کا کہنا ہے:

> ''ادب اگر آپ کی بصیرت میں اضافہ نہیں کرتا۔۔۔آپ کے باطن کو وہ روشنی نہیں دیتا جو کبھی اساطیر میں، پھر مذہب و تصوف یا فلسفے نے تقسیم کی ہے۔تو ادب کی تخلیق محض مشقت ہے۔ہمارا سامنا ایک بنیادی قوت اور سچائی سے ہے اس کا رنگ روپ تخلیق میں آنا چاہیے۔۔۔''

ذوقی کا یہ ناول یقینی طور پر قاری کی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔۔۔یہ ادب عالیہ کا ایک ایسا شہکار ہے جو اُردو ادب میں اپنے قد سے آپ پہچانا جائے گا۔۔۔اس ناول کو مشاہیر ادباء اور نقادوں نے بھی ایک بلند قامت ناول تسلیم کیا ہے۔۔۔معروف ادیب، محقق اور نقاد نظام صدیقی کا کہنا ہے۔

یہ محض ذو معنی موضوعاتی اور ساختیاتی امکانات کا حامل نہیں ہے بلکہ یہ انگنت تعبیراتی ممکنات (Mutivalent interpretative possibilities) کا امین ہے۔اس ناول سے پرانے فکشن کی مصنوعی طور پر بنی اور کاڑھی ہوئی داخلی اور خارجی فضا کی روتشکیل ہوتی ہے۔یہ اکیسویں صدی کے تناظر میں اُردو فکشن میں نئے موسموں کی آمد کا خوشگوار علامیہ ہے۔اس غیر معمولی ناول کی داخلی ماحولیاتی اشراکیت افروزی اور بیک وقت ''عالم کاری'' کی ثقافتی ماحولیاتی زلزلہ پیمائی سے اُردو فکشن کا پرانا عہد نامہ ختم ہوتا ہے اور نئے ناولاتی عہد نامہ کا حسین اور معنی خیز ہوتا ہے۔یہ Creative Novel of Trace ہے جو نئی انسانی اقداری اور حسیاتی معنویت و اہمیت کا اولین ناولاتی مکاشفہ ہے۔یہ اکیسویں صدی میں ''نئے عہد کی ناولاتی اور افسانویاتی تخلیقیت'' کا قطبی ستارہ ہے۔

ابن حسن

جمالیات (۱۱)

ادب اور معروضی حقیقت

رابندرا ناتھ ٹیگور/ نیر عباس زیدی

نجات

گوری ایک، امیر کبیر خاندان کی، خوبصورت اور نازوں کی پلی بیٹی تھی۔ اس کے شوہر پاریش نے اپنی ذاتی کاوشوں سے اپنی تنگ دستی دور کی اور ایک اچھے معاشرتی مقام پر فائز ہوا۔ جب تک وہ تنگ دست رہا گوری کے والدین نے گوری کو اپنے گھر ہی میں رکھا کیونکہ وہ اپنی بیٹی کو محرومیوں سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا جب وہ اپنے خاوند کے گھر آ کر آباد ہوئی تو وہ نوجوان نہیں رہی تھی۔ پاریش کو یہ احساس کبھی نہ ہوا کہ گوری کا تعلق اس سے ہے۔ وہ اپنے شہر کے مغرب کی طرف واقع ایک چھوٹی تحصیل میں وکالت کرتا تھا اور اس کا کوئی رشتہ دار اس کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ اس کی سوچوں کا محور محض اس کی بیوی تھی۔ یہاں تک کہ وہ کبھی کبھار عدالت کا وقت ختم ہونے سے پہلے ہی گھر واپس آ جاتا۔ ابتداء میں تو گوری یہ سمجھنے میں ناکام رہی کہ یہ اتنی جلدی واپس کیوں آ جاتا ہے اور کبھی وہ اپنے ملازمین میں سے کسی ایک کو بلاوجہ کیوں برطرف کر دیتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اسے زیادہ دیر تک کیوں نہیں بھاتا، خاص طور پر اگر گوری کسی ملازم کو اس کے کارآمد ہونے کی وجہ سے برقرار رکھنا چاہتی تو جلد ہی اس کی برطرفی یقینی ہوتی۔ گوری ایک خوش مزاج خاتون تھی لیکن اس بات پر وہ اپنی خفگی کا اظہار کرتی، اس کی خفگی اس کے شوہر کے رویے کو مزید خراب کر دیتی ہے۔

اس پر بھی پاریش کی تسلی نہ ہوئی، اسنے خفیہ طریقے سے گھر کی ایک ملازمہ سے گوری سے متعلق پوچھ گچھ شروع کر دی۔ اس بات کا علم گوری کو ہوا، اگرچہ وہ ایک کم گو خاتون تھی مگر اس ذلت پر اس کی انا مجروح ہوئی اور وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح گرج اُٹھی۔ دیوانگی پر مبنی یہ شک ان دونوں کے درمیان دشمن کی تلوار کی طرح حائل ہو گیا۔ پاریش کو جب یہ ادراک ہوا کہ اس کی بیوی اس کا مطمعٔ نظر سمجھ گئی ہے تو اس نے گوری کے سامنے بھی اس پر الزام تراشی سے گریز نہ کیا۔ اس تمام صورتِ حال کا سامنا گوری جتنی خاموشی سے کرتی اتنا ہی اس کا شوہر حسد کی آگ میں جلتا۔

اپنی ازدواجی خوشیوں سے محروم گوری اب اپنے سکونِ قلب کے لئے مذہب کی طرف راغب ہوئی اور اس نے اپنے قریبی مندر کے ایک نوجوان مبلغ پرامند اسوامی کو بلایا، اسے باقاعدہ اپنا روحانی گرو مقرر کیا اور اس سے مقدس گیتا کی تشریحات سننے لگی۔ اس کے اندر کی عورت کی تمام محبت و چاہت، احترام و عقیدت بن کر باہر نکلی اور اپنے گرو کے سامنے سجدہ ریز ہو گئی۔

پرامند ا کی پاکبازی سب پر عیاں تھی اور لوگ دل کی گہرائیوں سے اس کی عزت کرتے چونکہ پاریش پرامند اسوامی کے خلاف کوئی بات کرنے کی جرأت نہ کر سکتا اس لئے اس کا حسد ایک کینسر

کی طرح پاریش کو کھا رہا تھا۔ کسی ایک معمولی سے واقعے سے اس کا لاوا پھٹ پڑا اور پاریش نے اپنی بیوی کے سامنے پرامنند اسوامی پر دشنام طرازی شروع کر دی اور اسے منافق کا درجہ دیتے ہوئے کہا: ''کیا تم قسم کھا سکتی ہو کہ تم اس 'سارس' کی محبت میں گرفتار نہیں جس نے ایک گرو کا بہروپ دھارا ہوا ہے؟''

گوری اپنے شوہر کے شک کی وجہ سے دیوانی ہوگئی، سانپ کی طرح پھن مارتی ہوئی اُٹھی اور طنزیہ انداز میں بولی: ''اور اگر ایسا ہے تو؟'' پاریش فوراً صحن میں چلا گیا اور گوری کو کمرے میں بند کر دیا۔

غصے کی انتہاء پر پہنچی ہوئی گوری کسی نہ کسی طرح کمرے کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوگئی اور گھر سے باہر چلی گئی۔

پرامنند اسوامی اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا کسی مذہبی کتاب کے مطالعے میں غرق تھا۔ شفاف آسمان سے روشنی کی طرح گوری اچانک اس کے کمرے میں نمودار ہوئی۔

''تم یہاں؟'' گرو نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اے مقدس گرو! مجھے اپنے گھر میں ہونے والی تذلیل سے بچائیں اور مجھے اپنے قدموں میں خدمت کرنے کی اجازت دیں۔''

گرو نے انتہائی سختی سے سرزنش کر کے اسے گھر واپس بھیج دیا، لیکن مجھے یقین نہیں کہ گرو، اس کے بعد، اپنے مطالعے کے تسلسل کو برقرار رکھ سکا ہوگا۔

پاریش گھر واپس آیا، دروازہ کھلا دیکھ کر اس نے پوچھا ''یہاں کون آیا تھا؟''

''کوئی نہیں!'' اِس کی بیوی نے جواب دیا، ''میں اپنے گرو کے پاس گئی تھی''۔

''کیوں؟'' پاریش غصے سے لال پیلا ہوگیا۔

''کیونکہ میں ایسا کرنا چاہتی تھی۔''

اس دن سے پاریش نے گھر کے باہر ایک دربان بٹھا دیا اور گوری سے اپنا رویہ اتنا سخت کر دیا کہ اس کے حسد کے قصے پورے علاقے میں مشہور ہوگئے۔

اپنی شاگرد کی تذلیل کی خبریں پرامنند اکی عبادات میں خلل انداز ہونے لگیں۔ اس نے سوچا کہ اسے فوراً یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ بیک وقت وہ اس بات پر بھی تیار نہ تھا کہ وہ اس مظلوم عورت کو ایسے وقت میں تنِ تنہا چھوڑ دے۔ کسے معلوم کہ وہ عبادت گزار عورت کس حال میں ہے؟

بلآخر اس محصور گوری کو ایک دن ایک رقعہ ملا جس میں لکھا تھا، ''میری بیٹی! یہ درست ہے کہ کئی پاکباز خواتین نے بھگوان کی پراپتھنا کی خاطر دنیا ترک کی۔ ہوسکتا ہے کہ دنیاوی مصائب تمہارے خیالات کو بھگوان سے دور لے جائیں۔ میں بھگوان کی رکھشا سے اس کی باندی کو پوجا اور خدمت کی خاطر بچا لے جاؤں گا۔ اگر تم چاہو تو تم اپنے باغ میں پانی کے تالاب کے قریب کل دوپہر دو بجے مجھے مل سکتی ہو۔

گوری نے وہ رقعہ اپنے جوڑے میں چھپا لیا۔ اگلے روز دوپہر کے قریب جب نہانے سے

پہلے اس نے اپنے بال کھولے تو اس وہ رقعہ نہ ملا۔ وہ حیران تھی کہ کہیں وہ رقعہ بستر میں تو نہیں گرا اور اس کے شوہر کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ پہلے تو اسے انتہائی خوشی محسوس ہوئی کہ اسے یہ رقعہ دیکھ کر شدید غصہ آئے گا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اس رقعے کا، جسے اس نے اپنی نجات کا نورانی تاج سمجھ کر سر پر پہنا تھا، پاریش کے گستاخ ہاتھوں میں چلے جانا بے حرمتی ہے۔

وہ تیز قدموں سے اپنے شوہر کے کمرے کی طرف گئی۔ وہ فرش پر پڑا کراہ رہا تھا، آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں اور منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ گوری نے وہ خط اس کی گرفت سے چھڑایا اور فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔

ڈاکٹر نے کہا کہ یہ مرگی کا دورہ تھا اور وہ فوت ہو چکا ہے۔ اتفاق سے اسی دن پاریش کو کسی ضروری کام سے شہر سے باہر جانا تھا۔ پرامنند اکو اس بات کا علم ہوگیا تھا اور اس نے گوری سے ملاقات کے لئے کہا تھا۔ وہ کس شدت سے اس لمحے کا منتظر تھا!

بیوہ ہو جانے والی گوری نے جب کھڑکی سے باہر دیکھا تو اس کا گرو کسی چور کی طرح تالاب کے قریب چھپا ہوا تھا۔ گوری نے اپنی نگاہیں ایسے جھکا لیں جیسے چمک کی وجہ سے چندھیا گئی ہوں اور اسی چمک میں اس نے محسوس کر لیا کہ اس کے گرو کی کتنی ہتک ہوگی۔

گرو نے آواز دی، ''گوری!''

''میں آ رہی ہوں!'' گوری نے جواب دیا۔

جب پاریش کے دوست اس کی موت کی خبر سن کر اس کے گھر پہنچے تو انھوں نے گوری کی لاش کو بھی پاریش کی لاش کے قریب پایا۔ گوری نے زہر کھا لیا تھا۔ تمام لوگ گوری کی اس غیر معمولی وفاداری کی تعریف کر رہے تھے جو اس نے اپنے شوہر سے کی، اور اسی کے ساتھ ستی ہوگئی۔ ایک ایسی وفاداری جو اس خستہ حال دور میں معدوم ہے۔

☆☆☆

اوریانہ فلاشی/ خالد سعید

قسط ۱۳

ایک مرد

بیرونی کمرے سے بھی دو محافظین دوڑے اندر آئے۔ ''ارے وہ کدھر گیا؟!'' ''یہاں تو اُس کا نام نشان تک نہیں!'' ''یہ ناممکن ہے۔'' ''ناممکن؟ یہ کیسے ہوا؟ فوراً اُسے تلاش کرو!'' ''آج دوپہر کو اس کا کھانا کون لایا تھا؟'' ''تم لائے تھے، ہاں بالکل ٹھیک تم ہی تو اُس کے دوپہر کا کھانا لائے تھے!'' ''جھوٹے، ذلیل!'' ''اے تمہیں مجھے جھوٹا کہنے کی جرأت کیسے ہوئی، اور یہ کس کو کہہ رہے ہو۔'' ''تمہیں اور کسے'' ''جوانو، ہوش کے ناخن لو اور ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو، آؤ، مل کر اس مسئلے کا حل ڈھونڈتے ہیں، اچھا تو جب تم یہاں سے رخصت ہوئے تو کیا تم نے تمام تالے احتیاط سے لگائے تھے؟'' ''بالکل، اس میں کوئی شک وشبہ کی بات ہی نہیں!'' ''اور کنجیاں؟ اُس کے بعد تم نے کنجیاں کس کے سپرد کی تھیں؟'' ''میں نے وہ کنجیاں خود تمہارے حوالے کی تھیں، تمہیں بالکل یاد نہیں!'' ''مجھے؟ تم پر خداوند کی پھٹکار، جھوٹے لعین!'' ''جوانو، آپس میں جھگڑنے کا کوئی فائدہ نہیں! آؤ مل کر اُسے تلاش کرتے ہیں!'' اور انہوں نے تمہاری کھوج میں اپنی نگاہیں چھت اور دیواروں پر یوں دوڑائیں، جیسے تم کوئی مکھی تھے۔ دریں اثنا تم شدید ہنسی کو روکنے کی کوشش میں چارپائی کے نیچے سکڑے سمٹے اپنا دم سادھے ہوئے تھے۔ تم نے جس شے کی پیش بینی کی تھی، بعینہٖ اُسی طرح وقوع پذیر ہو رہا تھا، بس وہ تمہیں صرف اسی جگہ تلاش نہ کر رہے تھے، جہاں تم ممکنہ طور پر چھپ سکتے تھے۔ کیا وہ اتنے ہی احمق ہیں کہ دوسری سنگین غلطی کا بھی ارتکاب کریں گے۔ یعنی دروازوں کو تالے لگائے بغیر تمہاری تلاش میں باہر نکل جائیں گے؟ اَب ایک مضحک صورتحال تھی، جس چارپائی تلے تم چھپے بیٹھے تھے، وہ اسی کے اوپر بیٹھے ہانپ اور کراہ رہے تھے۔ ''لیکن وہ کمینہ یہاں سے کیسے بھاگا، خداوند یسوع کی قسم کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ اتنا بڑا آدمی آخر یہاں سے نکلا کیسے؟'' پھر ایک آواز اُبھری ''ہمیں خطرے کی گھنٹی بجانے کے لیے کہنا چاہیے'' اور مقبرے کے دروازے کھلے چوپٹ چھوڑ کر وہ الارم الارم کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئے۔ اَب تو پوری جیل میں ایک ہی پکار سنائی دے رہی تھی: ''الارم! الارم!'' تم نے چند لحظوں کے لیے توقف کیا، اور پھر دوسرے محافظین کی ہمرکابی میں خود بھی یہی پکارتے اور چیختے ہوئے باہر نکل لیے: ''خطرہ گھنٹی، خطرہ گھنٹی!'' تم پہلے ایک درخت تک اور پھر کچن کی عمارت تک پہنچے۔ ایک سایہ سا جیسے تمہارے قریب سے گزرا، ایک مسلح فوجی، اُس نے تم سے پوچھا: ''کیا تم نے اُسے دیکھا؟'' ''بالکل، وہ نیچے اُس طرف!'' تم نے پورے اطمینان سے جواب دیتے ہوئے اُس شخص کی جانب اشارہ کر دیا، جو تمہاری مخالف سمت میں بھاگا چلا جا رہا تھا۔ اُس نے تمہارا شکریہ ادا کیا اور پھر پوری قوت سے چیختا چلاتا ہوا اُس کے پیچھے دوڑتا چلا گیا، جو بھی تم سے پوچھتا، ''وہ دیکھئے، نیچے اُس طرف، وہ رہا۔'' کسی بھی شخص نے تمہاری طرف توجہ دینے کی زحمت نہ کی، اور نہ ہی کسی کو سپاٹ لائٹس جلانے کا خیال آیا۔ اِن حالات میں ظاہر ہے کہ تم بیرونی دیوار کی جانب بڑھے اور وہاں پہنچ گئے۔ اَب تم دیوار پر چڑھ کر اوپر اُس جگہ پہنچ گئے جہاں خاردار تار لگی تھی۔ تم نے

خاردار تار کو چھو کر دیکھا، تم بالکل محفوظ رہے، یعنی اس میں برقی رو قطعاً نہ دوڑ رہی تھی، لیکن اس سے تمہارا ماس بُری طرح چیرا گیا، اور تم اُس سے کہیں زیادہ گھائل ہوئے، جب تم موراکس (Morakis) کے ہمراہ یہاں سے فرار ہوئے تھے۔ اس بار تمہیں اس الجھاؤ سے اپنے آپ کو نکالنے میں کتنا وقت لگے گا؟ رات کی اتھاہ تاریکی تو بلاشبہ تمہاری مدد کر رہی تھی، لیکن اَب تمہیں خیال آیا کہ کسی صورت خطرے کی گھنٹی کو روکنا چاہیے۔ سو تم نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر ایک میگافون بنایا اور چلا کر کہا: ''خطرے کی گھنٹی بند کر دو! خطرے کی گھنٹی بند کرو!'' ایک دوسری آواز نے اِس بات کو دوہرا دیا: ''خطرے کی گھنٹی بند کر دو!'' اور واقعی خطرے کی گھنٹی کا بجنا روک دیا گیا! پھر ایک سرجنٹ نے شدید غصے میں چلا کر کہا: ''خطرے کی گھنٹی کس نے روکی ہے؟'' ''اس نے''، ''اَبے اُس نے کون؟'' ''سر، اُس نے جو سویلین لباس پہنے تھا۔'' ''احمقو، بے وقوفو، سویلین لباس میں کون تھا؟ اُس کا پتہ لگاؤ!'' تم نے ایک ٹانگ کی مدد سے تار کو الگ کیا، لیکن تمہارا بازو اس میں پھنس گیا، تم نے زور لگا کر اسے نکالنے کی کوشش کی اور تمہاری آستین لہو میں بھیگ گئی۔ تمہیں لگا جیسے تمہاری کوئی شریان کٹ گئی ہے اور اس شدید دکھن نے تمہیں چند لحظوں کے لیے مفلوج کر دیا۔ ''میں نے اُسے دیکھا تھا!'' ''مگر کہاں؟'' ''دیوار پر! حد ہے، بھاگو، پکڑو، جانے نہ پائے!'' ایک سپاٹ لائٹ تمہاری جانب آئی اور تم روشنی میں نہا گئے اور اُس سمے، بس تم دیوار سے نیچے چھلانگ لگانے ہی والے تھے، جب تمہیں محسوس ہوا کہ کسی نے تمہیں پکڑ لیا ہے اور ساتھ ہی ایک آواز آئی: ''سرجنت وہ میرے ہاتھ آ گیا ہے!''

اور اُس کے بعد تم ایک مختصر المدت بھوک ہڑتال پر چلے گئے۔ ادھر دنیا بھر کے ادیب، شاعر اور دانشور ابھی تک تمہاری خیریت کے بارے میں فکرمند تھے اور زاکاراکس (Zakarakis) کا یہ خوف اور وسوسہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا کہ اَب تم نہ بچو گے۔ ''ارے تھوڑا سا کھا لو!'' ''نہیں''، ''تمہیں خداوند یسوع کا واسطہ، مہربانی کرو، بس تھوڑا سا کھانا کھا لو!'' ''ہرگز نہیں، مطلق نہیں۔'' ''یہ کھانا تمہاری اماں، خود تمہارے لیے بنا کر لائی ہیں۔'' ''ٹھیک ہے کھانا تو اچھا ہی ہوگا، تم یہ کھانا میری اماں کو ہی کھلا دو۔'' ''اچھا، بولو، اَب تم کیا چاہتے ہو؟'' ''میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ مجھے کرنل کی وردی چاہیے اور مجھے اس کا استحقاق بھی ہے، بولو، میں نے اُس سیل سے تمہیں بھاگ کر دکھایا کہ نہیں؟ میں نے یہ شرط جیتی ہے!'' ''بالکل نہیں، میں نے تمہیں پکڑ لیا تھا۔'' ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے، میں نے تمہیں سیل سے فرار ہو کے دکھا دیا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ تم ایک کودن اور نرے گاودی ہو۔'' ''کودن تم خود!'' ''نہیں میری ذہانت میں تو کوئی شبہ نہیں کر سکتا اور مجھے ہر صورت کرنل کی وردی چاہیے؟'' ''مگر تم کرنل کی وردی کا کیا کرو گے؟'' ''میں۔۔۔ میں اسے پہنوں گا۔ ایسٹر کے تہوار کا میلہ لگنے والا ہے۔ اس میلہ میں لوگ خوشی منانے کے لیے عجیب وغریب مضحکہ خیز لباس پہنتے ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز لباس کرنل کی وردی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمہارا آقا فوجی آمر، پاپاڈوپاولس (Papadopoulis) یہی وردی ''زیب تن'' کرتا ہے۔'' ''بکومت حرامزادے!'' ''مسخرے!'' اگلے دن پھر اسی طرح کا مکالمہ جاری رہا۔ بالآخر زاکاراکس نے انتہائی مایوسی اور غصے کے عالم میں چلا کر کہا: ''اس بدبخت کو کرنل کی ایک وردی

لا دو!‘‘ ’’سر پوری جیل میں ہمارے پاس یہ وردی نہیں ہے کیونکہ یہاں کوئی کرنل نہیں ہے۔‘‘ ’’تو پھر کہیں سے ڈھونڈ کر اسے لا دو!‘‘ خیر انہوں نے کہیں نہ کہیں سے تمہیں وہ وردی مہیا کر دی۔ اور تم نے اسے پہن کر کھانا کھا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد زاکاراکس (Zakarakis) واپس آیا: ’’اَب مجھے یہ وردی واپس کر دو۔‘‘ ’’تم مر بھی جاؤ، تب بھی نہیں دوں گا، بالکل نہیں۔‘‘ ’’میں نے تمہیں یہ وردی صرف اس لیے دی تھی کہ تم کھانا کھا لو، اَب جبکہ تم نے بھوک ہڑتال ختم کر دی ہے، تو وردی مجھے واپس کرو۔‘‘ ’’ہرگز نہیں، مطلق نہیں‘‘ ’’اس کی وردی زبردستی اتروالو!‘‘ اُن میں سے پانچ محافظین نے تم پر ہلہ بول دیا، وہاں جگہ کی اس قدر کمی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو ٹکریں مارتے رہے اور اُن کی کہنیاں دیواروں سے رگڑ کھاتی رہیں۔ بہرحال بعد از خرابی بسیار انہوں نے تم سے وردی اتروا ہی لی اور ساتھ میں وہ تمہارے جوتے بھی لے گئے۔ اُن دنوں رگوں میں خون منجمد کر دینے والی سردی پڑ رہی تھی۔ تم پھر بھوک ہڑتال پر چلے گئے۔ ’’کھاؤ‘‘ ’’مطلق نہیں‘‘ اَب تمہارا مطالبہ کیا ہے؟‘‘ ’’میرے جوتے‘‘ ’’یہ لو اپنے جوتے، اپنے سر مارو اور کچھ کھا لو!‘‘ ’’بالکل نہیں‘‘ ’’تو اَب تمہیں اور کیا چاہیے؟‘‘ ’’میں غسل کرنا چاہتا ہوں، اتنے دِنوں سے نہایا نہیں تو مجھے اپنے جسم سے بدبو کے بھبکے آ رہے ہیں اور زاکاراکس (Zakarakis) سب سے بری بات یہ کہ مجھے بھی تمہاری طرح جوئیں پڑ گئی ہیں۔‘‘ ’’میرے وجود سے نہ تو کوئی ناگوار بو آتی ہے اور نہ ہی مجھے جوئیں پڑی ہیں!‘‘ ’’بالکل تمہیں ایک جوں پڑی ہوئی ہے، جس کا وزن تقریباً نوے (۹۰) کلو ہے۔ تم ایک مجسم جوں ہو۔‘‘ ’’میں تمہیں مار ڈالوں گا!‘‘ ’’اور ایسی صورت میں تم مجھے قتل کرنے کے الزام میں کورٹ مارشل کا سامنا کرو گے، تمہیں شاید یاد نہیں کہ جنرل آئیونیڈیز نے تمہیں کیا کہا تھا؟‘‘ ’’اوہو، ٹھیک ہے، اسے غسل کرنے دو!‘‘ ’’پانی گرم ہونا چاہیے، مجھے گرم پانی سے غسل کرنا ہے۔ وگرنہ مجھے نمونیا ہو جائے گا، اور میں مر گیا، تو تمہارا کورٹ مارشل ہوگا۔‘‘ ’’اچھا اسے گرم پانی سے نہلا دو!‘‘ ’’مجھے ایک حجام کی بھی اَشد ضرورت ہے۔‘‘ ’’حجام کو بلاؤ!‘‘ گرم پانی کا ایک ٹب لایا گیا اور ساتھ ہی حجام بھی آ گیا۔ انہوں نے تمہیں نہلایا، تمہاری داڑھی مونڈھی اور زاکاراکس کے حکم کے مطابق تمہارے بال نصف سینٹی میٹر تک کاٹ دیئے، ایک بار پھر لڑائی شروع ہوگئی۔ ’’او جوؤں بھرے منحوس سور تم نے تو میری کھوپڑی کی کھال بھی اُتروالی ہے۔‘‘ ’’میں نے تمہاری کھوپڑی کی کھال قطعاً نہیں اُتروائی، بس صرف تمہارے بال چھوٹے کرائے ہیں، تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ تمہیں جوئیں پڑی ہوئی ہیں!‘‘ ’’جوئیں صرف کھوپڑی پر ہی تو بسیرا نہیں کرتیں، وہ تو جسم میں جہاں کہیں بال ہوتے ہیں، وہیں پڑ جاتی ہیں، لہٰذا تمہیں میرے جسم میں جہاں کہیں بال ہوں گے وہاں کی صفائی کرنا پڑے گی، بالخصوص بغلوں تلے اور میرے زیرِ ناف۔‘‘ ’’تم پاگل ہو! او میرے خداوند، انہوں نے ایک سو فیصد پاگل میرے سپرد کر دیا ہے۔‘‘ ’’زاکاراکس (Zakarakis) میں کوئی پاگل واگل نہیں اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں یہ سارا ناٹک اس لیے کھیل رہا ہوں کہ تمہیں پاگل بنا دوں اور اِس کھیل میں میری جیت یقینی ہے اور یہ ایک امر واقعہ ہے بالکل اُسی طرح کہ جیسے میں اس قبر میں قید ہوں۔‘‘ ’’اس کے پورے جسم سے بالوں کی صفائی کر دو!‘‘ ’’نہیں زاکاراکس،

نہیں، وہ نہیں، یہ کام تو تمہیں سرانجام دینا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں میرے جسم کو چھونے سے مزہ آتا ہے اور اس لیے بھی کہ تم ایک جوؤں بھرے نجس سور اور حرامی ہونے کے علاوہ ایک مفعول بھی تو ہو۔‘‘ اس نے انہیں حکم دیا کہ تمہیں اُس چارپائی سے باندھ دیا جائے اور پھر خود اُس نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے جی بھر کر مارا۔ اُس نے تمہیں اتنے شدید تشدد کا نشانہ بنایا کہ بعد ازاں اُسے ڈاکٹر کو بلانا پڑا، جو تمہیں دیکھتے ہی خوفزدہ ہو گیا: تمہارا پورا وجود، سر سے لے کر پاؤں کے ناخن تک لہو سے بھرے ایک لوتھڑے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ’’تمہارے ساتھ اتنا ظلم کس نے اور کیوں کیا؟‘‘ ’’زاکاراکس نے میرا یہ حال کیا ہے، دراصل اُس کی خواہش تھی کہ میرے پورے جسم سے بالوں کی صفائی ہو جائے۔‘‘ ’’تمہارے بدن سے بالوں کی صفائی؟!‘‘ ’’جی ہاں تاکہ وہ میرے ساتھ زنا بالجبر کر سکے۔ وہ کہتا ہے کہ استنبول کے چکلوں میں اسی طرح کیا جاتا ہے۔ میں نے اپنی آبرو بچانے کی کوشش کی اور اُس نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔‘‘ ’’تمہاری آبروریزی کی کوشش، او میرے خدا؟!‘‘ ’’اور کیا، وہ تو ہر شخص کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس بات سے تو ہر کوئی واقف ہے کہ وہ ایک مفعول ہے۔‘‘ اس بار زاکاراکس پر جگر کی بیماری کا حملہ ہوا۔ اور وہ ایک ہفتہ کے لیے بستر پر پڑ گیا۔

اَب تک تم دونوں بیک وقت ایک دوسرے کے لیے ظالم بھی تھے اور ظلم کا نشانہ بننے والے بھی۔ اور اس سمبندھ کی بنیاد دونوں کرداروں کے مستقل تبادلہ یا اُن کی بیک وقت تعبیر پر تھی اور یہ طے کرنا ایک امرِ محال تھا کہ تم دونوں میں سے کون دوسرے سے زیادہ سفاک تھا۔ غالباً تم زیادہ ظالم تھے۔ اس لیے کہ زاکاراکس (Zakarakis) کے ذہن کو بہتر طور پر سمجھتے تھے، جبکہ وہ تمہیں سمجھنے سے قاصر تھا اور وہ تمہیں سمجھ بھی کیسے سکتا تھا؟ تم جس شے کی نمائندگی یا اظہار کرتے تھے، وہ اُس دنیا سے اُس سے بھی کہیں زیادہ فاصلے پر تھا جتنا زمین سے الفا قنطور (یونانی دیومالا میں ایک تخیلاتی مخلوق جس کا جسم گھوڑے کا اور سر انسان کا ہے) اور اگر کوئی اُس کے سامنے اس دنیا کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا، تو اُس کے پیٹ میں ہنس ہنس کر ہزاروں بل پڑ جاتے، مثلاً یہ کہ سچا جانباز کبھی ہتھیار نہیں ڈالتا اور عام لوگوں اور اس میں محض یہ فرق نہیں ہوتا کہ اُس نے ابتدائی عظیم الشان کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہوتے ہیں یا کٹھن مہمات سر کی ہوتی ہیں یا اُس کے غرور عشق کا وہ بانکپن، جس کے ساتھ وہ قید و بند، ظلم و تشدد اور موت کا سامنا کرتا ہے، بلکہ یہ کہ جس تواتر سے اُس کے پائے استقلال میں کسی طرح کی لغزش یا لرزش نہیں آتی۔ وہ صبر و تحمل کے ساتھ دُکھ اور اذیتیں بھوگتا ہے، اور ردِعمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ غیرت و حمیت کے ساتھ اپنی دُھن اور ایذاؤں کو چھپاتا ہے اور انہیں اِن ایذاؤں کا حکم جاری کرنے والوں کے منہ پر دے مارتا ہے۔ اس کا انتہائی موثر خفیہ ہتھیار یہ ہے کہ وہ اپنے موقف سے کبھی دستبردار نہیں ہوتا، نہ ہی خود کو مظلوم سمجھتا ہے، نہ ہی دوسروں کے آگے اپنی اداسی اور مایوسی کو عیاں کرتا ہے اور جب کبھی ضروری ہو، تو وہ ستم ظریفی، طنز اور ٹھٹھول کے ہتھیار کو کام میں لاتا ہے اور یہی ہتھیار زنجیروں میں جکڑے ہوئے مردِ حر کے جری ساتھی ہیں۔ اور اسی لیے جب تم نے نئی جارحانہ پیش قدمی کی، تو ایک بار پھر وہ چکرا کے رہ گیا۔

جب تم آخری دھنائی کی دکھن سے بحال ہو رہے تھے، تو تم نے اپنا نیا حملہ نئے طرح کے حربوں کی توپوں کے ہنگام میں کیا۔ ایک شام تم نے اندرونی دروازے کی سلاخوں کو تھاما، تمہاری آواز ڈیوڑھی کی گرل والی چھت کی جانب تھی: ''براہِ کرم متوجہ ہوں! براہِ کرم توجہ دیجیے! ہم ریڈیو بوآ ئیاٹی سے خبریں نشر کر رہے ہیں! خصوصی بلیٹن! اس فضلہ فارم کا کمانڈنٹ نکولس زاکاراکس (Nicholos Zakarakis) جگر کی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک خبر یہ ملی ہے کہ اُس کے اس مرض کا سبب وہ حالت غیض وغضب ہے جب وہ مفعولوں کو ناپسند کرنے والے قیدی کے ساتھ زنا بالجبر میں ناکام ہوا۔ لیکن اَب مصدقہ ذرائع سے خبر ملی ہے کہ جب اُس قیدی نے اُس کی عقبی خواہشات کی تسکین کرنے سے انکار کر دیا۔ تو وہ حالت صدمہ میں جگر کے عارضہ کا شکار ہو گیا اگر بوآ ئیاٹی کے باسی اس سلسلے میں رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کرنا چاہیں تو فوری رابطہ کریں اور متعلقہ دفتر میں اپنا نام، پتہ، رینک اور سیریل نمبر درج کرا دیں۔ یاد رہے کہ زاکاراکس کی تسکین کی صورت میں، اُس کی جانب سے رضا کار کو انعام کے طور پر مسور کی پھلیوں کی انتہائی لذیز ڈِش پیش کی جائے گی۔'' اور اگلی صبح ''توجہ کیجیے سامعین، براہِ کرم فوری توجہ دیجیے، یہ ریڈیو بوآ ئیاٹی ہے، نیوز براڈ کاسٹ، خصوصی بلیٹن: ہمارے خصوصی نمائندے نے ابھی ابھی ہمیں خبر دی ہے کہ زاکاراکس نے اپنی بیماری کے سلسلے میں صریحاً غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اُسے جگر کی کوئی تکلیف نہیں۔ دراصل اُسے بواسیر کا مرض لاحق ہو گیا ہے قیدی کے مطابق، اُس نے اُس سور کے جسم کے متعلقہ حصہ کا خود مشاہدہ کیا ہے اور وہ اُس مرض کا شکار اُس وقت ہوا جب وہ قسطنطنیہ کے چکلہ میں مرد طوائف کے طور پر کام کر رہا تھا۔ زاکاراکس پر اس مرض کا دوبارہ حملہ وزیر انصاف وامن عامہ سے مکالمہ کے بعد ہوا، اور وزیر موصوف نے طیش میں آ کر اُس کے چوتڑوں پر ایک زوردار لات رسید کی۔'' ہر شام باقاعدگی سے یہ تماشہ ہوتا اور دیوار سے پرے بیرکس میں اِس نشریات سے اس قدر تفریح اور تفنن طبع کا سامان فراہم ہو جاتا کہ فوجی محافظین نے شام کو اجازت نامہ لے کر باہر جانا کم سے کم کر دیا، بلکہ عموماً جب انہیں اجازت نامہ مل بھی جاتا تو وہ یہ سہولت لینے سے انکار کر دیتے: ''یار آج کی رات تم کہاں جا رہے ہو، وہ مشہور فلم دیکھنی ہے؟'' ''نہیں بالکل نہیں، میں آلیکاس کے خصوصی بلیٹن کو سنوں گا'' یا: ''کیا تم گذشتہ شب شہر گئے تھے۔'' ''نہیں تو، میں تو پانا گاولس کے خصوصی بلیٹن کی سماعت کے لیے اِدھر ہی رہا۔'' اکثر فوجی افسران بھی بظاہر ایک لاتعلقی کے ساتھ سامعین میں شامل ہو جاتے۔ اُن کی دلچسپی اس بات میں ہوتی تھی کہ آخری براڈ کاسٹ تم نے اور کیا کچھ ایجاد کیا ہے۔ قسطنطنیہ کے اسطوری چکلے میں زاکاراکس کے جنسی تجربات کا ایک سیریل چل جاتا۔ ویسے بھی تم ہر بات اور واقعہ کو ایک دلچسپ ڈرامائی موڑ دے کر ختم کرنے میں حد درجہ مہارت رکھتے تھے۔ ''پیارے سامعین، اَب باقی رازوں سے کل پردہ اُٹھایا جائے گا، اَب آلیکاس کو اجازت دیجیے۔ خدا حافظ۔'' مجھے یہ کہانی اور اس کے پلاٹ کی تفصیلات تو یاد نہیں رہیں، بہرحال ایک خاص موڑ پر آ کر وہ مرد طوائف نہ رہا، اور اُس نے خوشی سے خود کو خصی کرا لیا تا کہ وزیر اعظم کا مقرب خاص ہیجڑا بن سکے۔ یہاں سے ناقابلِ یقین فحاشی کا وہ سلسلہ وار پروگرام چلا،

جس نے بہت سے اور کرداروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وزیر اعظم پاپاڈوپاولس تھا، خلیفہ آئیونیڈیز اور مجلس شوریٰ کا چالباز رُکن ہیزرکس اور جلاد تھیوفلیوانکوس تھا۔ خلیفہ اور وزیر اعظم کی آپس میں رقابت بھی چلتی تھی اور وہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں منصوبہ بند کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح جلاد اور مجلس شوریٰ کا چالباز رُکن بھی ایک دوسرے کے خلاف نفرت انگیز حربے آزماتے رہتے تھے۔ لیکن ہیجڑے کو شرمسار اور ذلیل کرنے کے لیے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد ہو جاتے اور اُسے اپنا دفاع کرتے ہوئے اَن گنت پست اور قابلِ نفریں اطاعتوں کے اظہار سے گزرنا پڑتا۔

بالآخر زاکاراکس تمہارے پاس آیا۔ وہ دروازے کے ساتھ جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے اور آنکھوں میں تکان اور ماندگی نمایاں تھی: ''آلیکاس، میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' خوش آمدید، زاکاراکس (Zakarakis) اسے اپنا گھر ہی سمجھو اور ویسی ہی آسائشیں تمہیں یہاں ملیں گی دیکھو تو یہاں تمہارے لیے کتنی کھلی جگہ ہے۔ یہ ایک عالیشان دیوان خانہ ہے، آپ صوفے پر بیٹھنا پسند کرو گے، یا اِن آرام کرسیوں میں سے کسی ایک پر، لیکن ایک بات کا دھیان رہے، کہ مجھے چھونا بھی نہیں اور بوسے بازی بھی نہیں کرنا، آج تو میں خصوصی طور پر خود کو باعفت محسوس کر رہا ہوں۔'' ''آلیکاس، میری بات دھیان سے سنو، مجھے پتہ ہے کہ تم میرے ساتھ مسخریاں کر رہے ہو۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ خود تم بھی اِس بات کو اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ایک صاف ستھرا، شریف اور نارمل انسان ہوں۔ میری ایک شریف بیوی اور دو بچے ہیں۔'' ''زاکاراکس (Zakarakis)، تمہاری بیوی تو محض ایک پردہ ہے۔ اکثر مفعولوں کی بیویاں ہوتی ہیں، اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُن کے بچے حقیقت میں کس کے نطفے سے ہوتے ہیں۔'' ''حرامی، کمینے، ذلیل!'' ''زاکاراکس (Zakarakis) مجھے چھونا بھی نہیں اور نہ ہی میری بے عزتی کرنا، وگرنہ میں ریڈیو پر یہ بھی نشر کروں گا کہ تم ایسی بیوی کے شوہر ہو، جس کے جگہ جگہ غیر محرموں کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں۔ اوہو، مجھے تو خیال ہی نہیں آیا، خیر کوئی بات نہیں آج رات کے بلیٹن میں، میں تمہیں ہیجڑے کی پوزیشن سے ہٹا دوں گا اور وزیر اعظم کی پسندیدہ داشتہ سے تمہاری شادی کرا دوں گا، یوں تم خود بخود ایسے بے غیرت شوہر بن جاؤ گے، کیونکہ تمہاری بیوی کے خلیفہ سے بھی ناجائز مراسم ہوں گے۔'' ''آلیکاس میری بات تو سنو، میں تمہاری ذہنی کیفیت کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ میں نے نفسیات پر بھی ایک عدد کتاب کا مطالعہ کیا ہوا ہے اور میں انسانی ذہن کے بہت سے مخفی پہلوؤں کا علم رکھتا ہوں۔ بھئی تم نوجوان ہو اور تم جنسی ضروریات کے ہاتھوں تنگ ہو، یہی وجہ ہے کہ تم اتنے بے چین اور مضطرب رہتے ہو، میں بھی اُن دنوں، جب میں اطالوی فوجیوں کی قید میں تھا، ہر وقت تمہاری طرح بے چین و مضطرب رہتا تھا، کیونکہ مجھے بھی ایک عورت کی ضرورت تھی۔ لہٰذا میرے دوست اگر تم چاہو تو میں تمہیں مہینے میں ایک بار جوان عورت مہیا کر سکتا ہوں تا کہ تم اُس سے متمتع ہو سکو، لیکن نہیں اس سے تمہارا گزارا کہاں ہوگا، یوں کرتے ہیں ہفتے میں ایک بار، مجھے اُمید ہے اس انتظام سے تم خوش ہو جاؤ گے، ٹھیک ہے نا؟'' ''زاکاراکس میں کوئی بچہ نہیں، سب سمجھتا ہوں، یہ وہی ایک پُرانی کتھا ہے۔ تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں

متمتع کروں ہائے بے چارہ زاکاراکس، تم واقعی بری طرح میری محبت میں مبتلا ہو گئے ہو اور اِس مرضِ عشق میں تمہارا دماغ اتنا چل گیا ہے کہ مجھے تم پر رحم آنے لگا ہے، اگر کسی طرح یہ میرے بس میں ہوتا تو میں ضرور تمہاری خواہش پوری کر دیتا، تمہیں ایسی خواہش رکھنے کا حق بھی ہے لیکن میں نے تمہیں ہزاروں بار واضح طور پر بتا دیا کہ میں تمہارے ساتھ یہ نہیں کر سکتا، کیونکہ مجھے تم سے جنسی رغبت ہی نہیں محسوس ہوتی!''

''حرامی الدہر، عادی مجرم، غدارِ وطن!'' ''زاکاراکس اتنے پاگل مت بنو، یہ انصاف کی بات نہیں ہے، کیا یہ میرا قصور ہے کہ تمہیں دیکھ کر مجھے ایستادگی نہیں ہوتی؟ اور تمہارا اتنا تھل تھل کرتا بڑا پیٹ اور اوپر سے سر! زاکاراکس، یوں کرو، اپنی بیوی کو میرے پاس بھیج دو، اور ایسے گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے گی۔''

''پھانسی، تمہارا علاج صرف پھانسی ہے، میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں پھانسی کے پھندے میں لٹکا کر دم لوں گا!'' ''ارے یار اتنے غصے میں کیوں آ رہے ہو، چلو میں یہ قربانی دے ہی دیتا ہوں اور تمہارے ساتھ ___'' چشم زدن میں تم نے ایک جھٹکے سے سیل کے دروازے کو بند کیا، اپنے بائیں ہاتھ سے اُس کے بازوؤں کو قابو کر لیا اور دائیں ہاتھ سے اُس کی پتلون پھاڑ کر اُتار دی، اپنے گھٹنوں کی مدد سے تم نے اُسے دیوار کی جانب دھکیلا: مسلح فوجی محافظین، اُس کی خوفزدہ چیخ و پکار سُن کر لپکے اور عین وقت پر اُسے تمہارے آہنی شکنجے سے رہائی دلائی۔

اس واقعہ کے چند دنوں بعد ۱۹ اپریل کو تمہارے گدے میں آگ لگ گئی۔ زاکاراکس ہمیشہ اس اَمر پر مصر رہا اور اپنے بیوی بچوں کی قسمیں کھا کر کہتا رہا کہ یہ خود تمہاری حرکت تھی۔ تمہارے ہسٹریائی تحفوں کو جاننے کے پیشِ نظر، مجھے یہ مفروضہ زیادہ قرینِ قیاس لگتا ہے۔ حکمت عملی کے لحاظ سے یہ منصوبہ کوئی ایسا غلط یا احمقانہ قطعاً نہ تھا۔ محافظین دوڑ کر اندر آتے، اور اس بدنظمی، انتشار اور ہنگامے سے فائدہ اُٹھا کر تم اِدھر سے نکل کر بیرونی دیوار پھلانگ جاتے، لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ صرف دو دن پہلے وہ تمہارا تنکوں سے بھرا گدا اُٹھا کر لے گئے تھے اور کچھ عجیب و غریب اور مشکوک حرکات کرتے ہوئے انہوں نے تمہیں وہ گدا واپس کیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُن میں سے ایک دوست محافظ نے تمہیں سرگوشی کرتے ہوئے کہا: ''کیا تم نے گدے کے تنکوں میں کوئی خاص شے تو نہیں چھپائی تھی؟ میں نے کارپورل کوئی خاص شے تو نہیں چھپائی تھی؟ میں نے کارپورل کاراکاکسز (Karakaxas) کو اس گدے کے اندر کی تلاشی لیتے ہوئے دیکھا ہے۔'' یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تم نے زاکاراکس پر حملہ کیا، تو اِس واقعہ کے فوراً بعد اُس نے تمہیں سزا دینے کی خاطر، اور چیزوں کے ساتھ ساتھ ماچس کی ڈبیا اور سگریٹوں سے بھی محروم کر دیا تھا۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ جب تمہاری صحت قدرے بحال ہوئی تو ای ایس اے کا خاص بندہ میجر کاوٹراس (Koutras) تمہارے پاس آیا اور اُس نے تم سے کہا: ''اگر تم وعدہ کرو کہ اس واقعے کا کسی اور کے آگے ذکر نہیں کرو گے، تم ہم تمہیں پکا قول دیتے ہیں کہ تمہیں آزاد کر دیں گے، اور تمہیں بیرون ملک بھگا دیں گے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تم آخر تک میرے سامنے پُرجوش طریقے سے اس بات کو دوہراتے رہے! ''میں قسم اُٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے وہاں آگ نہیں لگائی تھی۔ یہ خود اُن کا کیا دھرا تھا،

میں نے مصلحت یا ضرورت کے تحت بعض چیزوں کے بارے میں جھوٹ ضرور بولا تھا۔ مگر جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے، ہرگز نہیں، میرے پاس ماچس کی ڈبیا تو کجا ایک دیا سلائی بھی نہیں تھی، اس لیے اگر میں ایسا کرنا بھی چاہتا، تو بھی میں یہ سب کچھ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ تمہیں مجھ پر یقین کیوں نہیں آتا؟ تقریباً سات بجے شام میں نے سیٹی کی آواز سُنی، پھر ایک چھوٹا سا دھماکہ ہوا اور گدے میں آگ لگ گئی۔ میرا پختہ یقین ہے کہ انہوں نے اس میں سلفر اور پلاسٹک ایسا دھماکہ خیز مواد خود رکھا تھا۔'' بہرحال یہ سب کچھ وقوع پذیر ہوا، اور زاکاراکس نے تمہیں ہلاک کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آہنی سلاخوں کے ساتھ لٹک کر تم نے اُن کی منت کی کہ وہ دروازہ کھول دیں۔ ''میں جل رہا ہوں، میرا سانس گھٹا جا رہا ہے، میں مر رہا ہوں۔'' مگر کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ تمہاری دلدوز چیخوں کے ساتھ ساتھ، دھوئیں کے بادل بلند ہوتے رہے، اور وہ زیادہ سے زیادہ کثیف ہوتے ہوئے ڈیوڑھی کی گرل سے بھی باہر آ گئے، مگر اُن محافظین میں سے کوئی بھی تمہاری مدد کو نہ آیا۔ زاکاراکس نے سختی سے انہیں کوئی بھی حرکت کرنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ دوست محافظ، جس نے تمہیں کاراکاکسز کی حرکت کے بارے میں اطلاع فراہم کی تھی، زاکاراکس کے قریب کھڑا تھا، اور اُس نے چلا کر کہا: ''کمانڈنٹ، ہمیں کچھ کرنا چاہیے! وہ زندہ روسٹ ہو جائے گا!'' اور زاکاراکس نے کہا: ''گھبراؤ نہیں جوان، مطمئن رہو، یہ اُس کے معمول کے حربوں میں سے ایک ہے۔'' اُسے اس سلسلے میں اپنا ذہن بنانے میں کافی وقت لگا، تب تک وہ سیل ایک دہکتا ہوا تنور بن چکا تھا، گدے سے آگ کے شعلے لپک رہے تھے اور تم زمین پر بے ہوش ہوئے پڑے تھے۔ جب ڈاکٹر کو بلایا گیا تو اُس نے تمہیں دیکھتے ہی گہری تشویش کا اظہار کیا اور انہیں مشورہ دیا کہ تمہیں فوراً ہسپتال پہنچایا جائے ورنہ تمہاری موت واقع ہو جائے گی، لیکن زاکاراکس نے تو انہیں تمہیں کھینچ کر باہر نکالنے اور کھلے میدان میں رکھنے کی اجازت دینے سے بھی انکار کر دیا۔ ''اسے سیل کی ڈیوڑھی میں بند کر دو۔'' انہوں نے دو دن تک وہاں تمہیں بے ہوشی کے عالم میں ایک چادر پر لٹائے رکھا۔ دوسرے دن بارش ہوئی اور پانی تمہارے اندر یوں جذب ہو گیا، جیسے کسی درخت کے اندر سرایت کرتا ہے۔ ڈاکٹر اپنی کاوشوں کے باوجود محض انہیں اِس حد تک قائل کر سکا کہ ایک چھتری کے ذریعے تمہارے چہرے کو ڈھانپا جا سکے۔ اَب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وزارتِ دفاع سے رابطہ کیا جائے، تاکہ پاپا ڈوپاولس کو اس معاملے میں مداخلت کے لیے درخواست کی جائے، لیکن اس سے پہلے کہ وہ مداخلت کرتا، تمہاری حالت حد درجہ خراب و خستہ ہو چکی تھی، تمہاری مونچھیں، بھوئیں اور پلکیں سب جل چکی تھیں۔ تمہارے چہرے اور ہاتھوں کی جلد پر چھالے نکل آئے تھے۔ تم نہ تو دیکھنے کے قابل تھے اور نہ ہی کچھ بول سکتے تھے۔ گاؤڈی کیمپ کے دارالشفا میں جہاں بعد از خرابی بسیار وہ تمہیں لے گئے تھے، تمہارے طبی معائنہ سے پتہ چلا کہ تمہارے خون میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار نوے فیصد ہو گئی تھی اور بوآئیاٹی پہنچتے زاکاراکس نے تمہارا استقبال اِن الفاظ کے ساتھ کیا: ''آلیکاس، آؤ، تمہارے لیے ایک خوش خبر، آخر تمہارے محبوب دوست کی ٹرٹر بند ہو گئی۔'' ''خس کم جہاں پاک۔'' پھر اُس نے تمہارے آگے ایک اخبار رکھا۔ اُس کی سرخی کچھ یوں لگی تھی: ''قبرص کے سابق

وزیرِ داخلہ اور دفاع، پولی کارپس جارجیز (Polycarpos Georgazis) ہلاک۔''

اخباری اطلاع کے مطابق وہ اپنی کار میں مردہ پایا گیا۔ اُسے سب مشین گن سے فائر کر کے ہلاک کیا گیا، قاتل فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور ایسی کوئی اُمید بھی نہ تھی کہ کبھی اُن کی شناخت کی جا سکے، کیونکہ قاتلوں نے اپنی کوئی نشانی نہ چھوڑی تھی۔ ایک شام پہلے جارج یزز (Georgazis) نے کچھ پُراسرار اور نامعلوم افراد سے ایک دور افتادہ گاؤں میں ملنے پر اتفاق کیا تھا۔ جب وہ گھر سے رخصت ہو رہا تھا تو اُس نے اپنی بیوی کو بڑی محبت اور جذباتی انداز میں گلے سے لگایا، اور پھر اُس نے کہا، ''اگر مجھے واپسی میں تاخیر ہو جائے، تو انہیں میری تلاش میں بھجوا دینا۔ تمہاری ہچکیاں بندھ گئیں، اور بآوازِ بلند ماتم و گریہ کرنے لگے اور یہ محض اس کی موت کا ہی غم نہ تھا۔ گو مقدمہ اور تفتیش کے دوران تم نے شدومد سے اُس سے کسی طرح کی مدد حاصل کرنے کے الزام کا انکار کیا تھا، لیکن ہیزز کس (Hazizkis) نے کسی طرح اُس اقدامِ قتل میں اُس کے کردار کے بارے میں مطلوبہ معلومات حاصل کر لی تھیں اور اُس کی پیش کردہ شہادتیں، اس قدر معتبر تھیں کہ قبرص کی حکومت اور یونان کی حکومت میں کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور اسی لیے جنرل آئیونیڈیز نے اُس جزیرے پر یونانی فوجیوں کی تعداد کو دوگنا کر دیا، اور چند ہی ہفتوں کے اندر وہ اقتدار، صدر میکاریوس سے قریبی دوستی اور دیگر سیاستدانوں کی جانب سے عزت و احترام، غرض یہ کہ ہر شے سے محروم ہو گیا۔ عام سیاستدان اُسے ایک ایسا بحری قزاق سمجھتے جو کسی بھی طرح ناعاقبت اندیشانہ اقدام اُٹھا سکتا ہے اور آخر میں وہ یونانی فوجی آمر پاپاڈوپاولس کی حقارت کا نشانہ بنا، جس نے کھلے عام یہ قسم اُٹھائی کہ وہ اُس سے گن گن کر بدلے گا۔ اُس دُور اُفتادہ گاؤں میں پُراسرار اور نامعلوم افراد سے اس کی ملاقات کا انتظام کسی ایجنسی یا ایجنسیوں نے کیا تھا، کس نے اُس کے لیے موت کا یہ جال بچھایا؟ پاپا ڈوپاولس فوجی جنتا کے کارندے یا سی آئی اے میں اُس کے مخالفین؟ کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ شاید دونوں ایجنسیوں نے باہمی مشاورت سے یہ ''کارنامہ'' سرانجام دیا تھا؛ بہرحال تم نے اپنا سچا دوست کھو دیا تھا، وہ انسان جو تمہاری صلاحیتوں اور خلوص پر اعتماد کرتا تھا، وہ شخص جس نے دامے، درمے سخنے ہر طرح سے تمہاری مدد کی تھی۔ اور تمہیں جینے اور جدوجہد کرنے کی تعلیم دی۔ وہ انسان، جس کی تم اُسی طرح پُرجوش طریقے سے پرستش کرتے تھے، جیسے کسی سکول کا نوعمر بچہ اپنے مثالی استاد پر مرمٹتا ہے، یا جیسے کوئی چیلا اپنے گرو کا شیدائی ہوتا ہے۔ وہ بھی تمہارے بھائی جارج کی طرح دنیائے موجود سے جا چکا تھا۔ اور جارج کی مانند اُس کی موت کا کارن بھی تم ہی تھے۔ تم شکوہ کرتے بھی تو کس سے؟ تمہاری ہچکیاں بندھ گئیں۔ ضبط کے سب بندھن ٹوٹ گئے، صدمے اور گریہ سے پہلے تمہیں الٹیاں لگیں، متلی شروع ہوئی اور تم شدید بیماری کا شکار ہو گئے اور یوں ایک ماہ تک صاحبِ فراش رہے۔ ابھی تمہاری حالت بمشکل ہی سنبھلی تھی کہ زاکاراکس تمہارے لیے ایک اور المناک اور بدخبر لایا: ''آلیکاس، باہر آؤ، جلدی سے اپنا لباس تبدیل کر لو۔ صدرِ مملکت نے تمہیں چند گھنٹوں کے لیے پیرول پر رہا کرنے کا حکم دیا ہے۔'' ''مگر کیوں؟'' ''اس لیے کہ تمہارا باپ بسترِ مرگ پر ہے اور صدرِ مملکت نے تمہیں اُس سے الوداعی

ملاقات کی اجازت دی ہے۔ فراخدلی کا اتنا بڑا مظاہرہ؟ اگر یہ میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں اُسے دیکھنے کی اجازت قطعاً نہ دیتا، بلکہ یہ تو کیا، میں تو تمہیں اُس کی تصویر بھی نہ دیکھنے دیتا۔''

تمہیں اپنے اَبا سے بے پناہ محبت تھی۔ اس واقعہ کے برسوں بعد تم نے میرے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس طرح کے نازک اور لطیف جذبات تم نے اپنی امی کے لیے کبھی محسوس نہ کیے تھے۔ وہ بلاشبہ ایک آزاد، جفاکش اور سیماب صفت خاتون تھیں، مگر جب کبھی تم اپنے اَبا کو دیکھتے تو تمہارا دل موم سے بھی جلد پگھل جاتا۔ ایک منفی ایڈیپس کمپلیکس، یا پھر شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ عمر میں تمہارا اَبا تمہاری امی سے بہت بڑا تھا۔ بیٹے اُس کے بڑھاپے کے قیمتی پھل تھے اور اُس نے تمہیں یوں پالا تھا، جیسے ایک بوڑھا دادا اپنے پوتوں کو پالتا ہے۔ جب تم ایک بچے تھے اور اپنی اَمی کی پٹائی اور چھترول سے بچنے کے لیے چارپائی کے نیچے چھپ جاتے اور گھنٹوں، بھوک کی حالت اور پیشاب روک کر وہیں پڑے رہتے، اور اَمی چلا چلا کر کہتیں: ''باہر نکل خبیث، ابھی تمہاری مار باقی ہے۔'' اس کے برعکس اَبا ہمیشہ ایک پیار بھری سرگوشی میں کہتے: ''آ جاؤ، میرے بچے، میں صدقے، باہر آ جاؤ، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا، میں ہوں نا۔'' اور جب تم سکول کے طالب علم تھے اور تمہیں ساری ساری شام سکول کا کام کرنا اور پڑھنا ناقابلِ برداشت ہو جاتا، تو اَمی تمہیں کمرے میں بند کر کے دوہرا تالا لگا دیتی، اور اَبا تمہیں آنکھ مارتے ہوئے چپکے سے کہتے، ''اِدھر سے بھاگ آ میرے لعل، میں ساری صورتحال سنبھال لوں گا۔ اور اِن سب باتوں کے باوجود تمہارا اَبا کبھی ایک باغی نہ رہا تھا۔ وہ ایک پیشہ ور فوجی تھا، جس کی تعلیم و تربیت اور بڑھوت تعمیلِ حکم کے مکتب میں ہوئی تھی، اس نے اپنی جرأت و دلاوری کا اظہار ہمیشہ جنگ میں توپ و تفنگ کے فائر کے وسیلے کیا تھا۔ فوج ہی اُس کی دنیا تھی، اور قومی پرچم اُس کا دیوتا۔ اور جب تم نے جارج کی مانند فوجی وردی زیبِ تن کرنے کی بجائے، حساب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا، تو اُس پر کیا قیامت گزری تھی۔ تم اُس کیفیت کو محسوس کر سکتے تھے! اور جب تم فوجی بھگوڑے ہوئے تو اُس پر غم واندوہ کے کیا پہاڑ ٹوٹے ہوں گے، تم اس کا اندازہ لگا سکتے تھے، اور جب اُسے پتہ چلا کہ تمہیں جیل ہو گئی ہے تو وہ کس اذیت اور عذاب سے گزرا ہو گا اور جب انہوں نے اُسے ایک سو تین (۱۰۳) دنوں کے لیے گرفتار کیا اور تمہیں بہت بعد میں اس بات کا پتہ چلا کہ اُن دنوں اُس پر کیا کچھ بیتا۔ چھہتر (۷۶) برس کی عمر، جنگ میں بہادری کے تمغوں اور کرنل کے رینک کے باوجود اس سے ہر طرح کی بدسلوکی کو روا رکھا گیا اور اُسے بدترین ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا: ''اگر تمہارا کوئی اور جرم نہیں بھی، تو یہ جرم کیا کم ہے کہ اتنے بڑے مجرم کو اس دنیا میں لائے!'' یا: ''او بڈھے تم گھر کیوں جانا چاہتے ہو؟ تمہاری بیوی تو تمہیں چھوڑ کر بھاگ گئی ہے، وہ تم ایسے بڈھے کھوسٹ اور کھنڈر سے عاجز آ چکی ہے اور اَب وہ کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔'' انہوں نے اُس کی آنکھ پر ایسی چوٹ لگائی کہ اُس کی ایک آنکھ سے نگاہ جاتی رہی۔ اور جسمانی و ذہنی فالج سے اُسے کیسی کیسی شرمساریوں کا سامنا کرنا پڑا، اُس کا تصور ہی محال ہے۔ تقریباً آٹھ مہینے وہ کسی مسرت یا الم کے احساس کے بغیر ایک عالمِ اعراف میں لٹکا رہا۔ اس عرصہ میں اُس کے ساتھ کیا کچھ

ہوتا رہا، اُسے قطعاً یاد نہ تھا۔ اُس کے تصور میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ تمہیں سزائے موت ہو چکی ہے اگرچہ اُسے عارضی طور پر معطل کیا جا چکا ہے؛ اپنی کرسی یا بستر سے، جب کبھی اُسے ہوش آتا، وہ ہمیشہ ایک ہی سوال کرتا: ''آلیکاس کہاں ہے؟'' ''وہ بیرون ملک گیا ہوا ہے''، ''وہ وہاں کیا کر رہا ہے؟'' ''وہ اُدھر اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔'' ''وہ مجھے ملنے کیوں نہیں آتا؟'' ''وہ آ جائے گا، بہت جلد وہ آ جائے گا۔'' ''میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں، مجھے اُس سے ملنا ہے، مرنے سے پہلے صرف ایک بار میں اُسے اپنے سینے سے لگانا چاہتا ہوں۔'' تم بھی اُس کے سینے سے لگنا چاہتے تھے اور تم پر ایسے لمحات آتے جب اُس سے ملنے کی خواہش اتنی شدید ہو جاتی کہ خود تمہیں لگتا کہ جیسے پھر سے تمہارا بچپن لوٹ آیا ہے__ زاکاراکس (Zakarakis) کے ضبط کا بندھن ایک بار پھر ٹوٹا اور ایک حالت اشتعال میں اُس نے کہا: ''خیر، باقی باتیں چھوڑو، مجھے سیدھی طرح بتاؤ کہ تم اپنے باپ کے مرنے سے پہلے اُس سے ملاقات کے لیے تیار ہو رہے ہو یا نہیں؟'' ''نہیں!'' ''نہیں؟!'' ''کیا تمہیں واقعی جانے سے انکار ہے، میں نے صحیح سنا؟'' ''ہاں، زاکاراکس تم نے ٹھیک سنا، میں نے کہیں نہیں جانا، میں تمہارے نجس آقا پاپاڈوپاولس کو جعلی فراخدلی کا ناٹک رچانے کی اجازت نہیں دوں گا اور نہ ہی یہ کہ وہ مجھے بلیک میل کرتا پھرے۔ اور میں اُسے دنیا بھر کے اخبارات اور ٹیلی ویژن پر ایک گناہ گار اور تائب بیٹے کے اپنے باپ کے بسترِ مرگ پر جانے کے سفر کی دستاویز بتانے کا موقع بھی نہ فراہم کروں گا۔ دفع ہو جاؤ زاکاراکس، میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔'' ''وحشی جانور، تمہارے سینے میں دل نہیں، پتھر ہے!'' ''بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ زاکاراکس!'' ''آلیکاس تمہیں اپنا ذہن اور فیصلہ تبدیل کرنا پڑے گا! اور میں تمہیں اس پر مجبور کر دوں گا!'' ''دفع ہو جاؤ، اپنی منحوس صورت یہاں سے لے جاؤ ورنہ میں گلا گھونٹ کر تمہیں ہلاک کر دوں گا۔'' وہ مایوس نامراد وہاں سے چلا گیا مگر اگلی شام ایک خبر کے ساتھ لوٹا! ''حرامی الدہر، ذلیل، تو پھر سنو، تمہارا باپ مر چکا ہے! تمہیں اپنے سینے سے لگانے کی حسرت لیے وہ اس دنیا سے جا چکا ہے! سنا تم نے وہ مر گیا ہے!''

پہلے پہل تو تم نے کسی ردِعمل کا مظاہرہ نہ کیا، جیسے یا تو تم بہرے گونگے ہو چکے تھے، یا پھر تمہیں اس خبر کی کوئی پرواہ نہیں تھی مگر جب اُس نے تمہاری اِس بظاہر لاتعلقی اور بے حسی کو مدِنظر رکھتے ہوئے نفرت سے زمین پر تھوکا تو تم اچانک پھٹ پڑے تمہارے منہ سے ایک چنگھاڑ نکلی، جس میں کسی انسانی شے کا شائبہ تک نہیں تھا: ''زاکاراک ی، ی، ی، ی، ی، ی!'' تم نے اُسے گردن سے پکڑ لیا اور اُسے اُس وقت تک پوری قوت سے دبائے رہے حتیٰ کہ آکسیجن کی کمی سے اُس کا چہرہ نیلا پڑ گیا اور اُس کی زبان ایک ہولناک انداز میں باہر نکل آئی اور جب محافظین نے اندر آ کر اُس کی گردن پر تمہاری انگلیوں کی گرفت ڈھیلی کی، تب تک تم قریب قریب اُسے گلا گھونٹ کر مار چکے تھے۔

☆☆☆

غلام حسین ساجدؔ

ہمارے ساتھ خدا ہو کہ ہم خدا کے ساتھ
مگر رہے یہی وابستگی دُعا کے ساتھ

کشید کرتے ہوئے راحتِ وجود و عدم
دیئے کے ساتھ رہوں گا نہ میں ہوا کے ساتھ

نئے گلاب کریں گے مکالمہ کس سے
نکل پڑوں گا چمن سے اگر صبا کے ساتھ

چھلک نہ جائے کہیں ساغرِ متاعِ ہوش
رہوں گا آج کسی درد آشنا کے ساتھ

فشارِ ضبط سے رُکنے لگا ہے سانس مرا
مقابلہ ہے کسی صبر آزما کے ساتھ

پسند ہیں مجھے ملتان کے در و دیوار
نگار خانۂ اصطخر و نینوا کے ساتھ

اُسی چراغ سے نسبت رکھوں ابھی ساجدؔ
کہ دل لگاؤں کسی اور دل رُبا کے ساتھ

غلام حسین ساجدؔ

آنکھ لگتے ہی عجب رنگ بدلتا ہوں میں
بیٹھ جاتا ہوں کبھی نیند میں چلتا ہوں میں

آج تک میں کسی دیوار کا حصہ نہ بنا
رات پڑتے ہی اُسی شاخ پہ جلتا ہوں میں

عمر بھر جس سے گریزاں رہیں میری آنکھیں
اب اُسی خواب، اُسی رزق پہ پلتا ہوں میں

مجھ کو منظور ہے یہ قعرِ مذلّت ، لیکن
گر پڑوں تو بڑی مشکل سے سنبھلتا ہوں میں

جن کی کھلنے کی تمنا ہو مری روح پہ بوجھ
اپنے پیروں تلے وہ پھول مسلتا ہوں میں

اب بھی ہر حکم بجا لاتا ہوں اُس کا ساجدؔ
جو وہ کہتا ہے، اُسی وضع میں ڈھلتا ہوں میں

☆☆☆

غلام حسین ساجدؔ

زبانِ شوق کھلے، دل کا باغ کھل جائے
اگر وہ طوطیٔ شیریں مقال مل جائے

میں ڈر رہا ہوں بہت کھل کے سانس لینے سے
کہیں وجود کی بنیاد ہی نہ ہل جائے

بھلے تمام نہ ہو سلسلہ اذیت کا
کسی طرح مرے سینے کا چاک سل جائے

پڑا رہوں گا کسی اجنبی ستارے پر
جو میرے ساتھ یہ زنجیرِ آب و گِل جائے

طلب رہے نہ مجھے غیب کے خزانے کی
نہ اُس پری کے تعاقب میں میرا دل جائے

یہ انتظار ہے ساجدؔ کسی پری وش کو
کہ میرا دھیان بٹے اور زخم چھِل جائے

☆☆☆

غلام حسین ساجدؔ

کسی وجود میں جلتا ہوا چراغ ہوں میں
سوا اِس نگر کے اندھیرے پر ایک داغ ہوں میں

تمام شہر میں پھیلی ہوئی ہے نیند مری
فشارِ خواب سے چھلکا ہوا ایاغ ہوں میں

مرے قریب جو آنے لگا ہے بے کھٹکے!
اُسے یقین نہیں ہے کہ بد دماغ ہوں میں

مجھے مِٹانے چلے ہیں جو نقشِ پا کی طرح
اُنہیں یہ علم نہیں آخری سُراغ ہوں میں

رُکا ہوا بھی ہوں اور بھاگ بھی رہا ہوں میں
نظامِ کار کہیں ساعتِ فراغ ہوں میں

بدل سکوں گا نہ اِس دشت کی فضا ساجدؔ
کہ موجِ رنگِ بقا ہوں نہ کوئی باغ ہوں میں

غلام حسین ساجدؔ

آج وہ اور بھی تاخیر سے آئے گا میاں
اور مری خوبیٔ تقدیر سے آئے گا میاں

سبز ہونے کو ہے خِرقہ مری تنہائی کا
رنگ اِک جنبشِ تحریر سے آئے گا میاں

بند آنکھوں سے مری ٹوٹتی شریانوں تک
زخم چل کر کسی زنجیر سے آئے گا میاں

بانٹ دینا ہے کسی حفظِ مراتب کے بغیر
رِزق جتنا مری جاگیر سے آئے گا میاں

جس کی تقدیر بنایا گیا دشتِ غربت
لوٹ کر وہ بڑی توقیر سے آئے گا میاں

کوئی ملتان میں ویسا ہے نہ لاہور میں ہے
وہ پَری رُو کہیں کشمیر سے آئے گا میاں

صرف کہنے سے بدلتی نہیں دُنیا ساجدؔ
یہ اُجالا دمِ شمشیر سے آئے گا میاں

☆☆☆

غلام حسین ساجدؔ

اِک مہرباں کا رنگ بدلتا چلا گیا
جب دُور تک میں نیند میں چلتا چلا گیا

دیکھا تھا اُس نے آنکھ اُٹھا کر بس ایک بار
اِک آئنہ چراغ میں ڈھلتا چلا گیا

ہم بڑھ رہے تھے منزلِ مقصود کی طرف!
نشّے میں وہ بھی ساتھ اُچھلتا چلا گیا

کچھ رنگ تھے جو اُس کی ہوا سے بگڑ گئے
کچھ پھول تھے وہ جن کو مسلتا چلا گیا

اِک روز کارِ عشق سے اِس نے حذر کیا
اور اُس کے بعد میں بھی سنبھلتا چلا گیا

ساجدؔ مسافتِ شب یلدا میں میرے ساتھ
کوئی خیالِ صبح میں جلتا چلا گیا

غلام حسین ساجدؔ

اسیرِ عالمِ غیظ و غضب رہوں گا میں
کبھی اُداس رہا ہوں نہ اب رہوں گا میں

رہے گا دھیان مرا خام کاریٔ دل پر
حصارِ سیلِ مسرت میں کب رہوں گا میں

اُسے پُکار کر آیا اگر قرار مجھے
نقیبِ راحتِ حُسنِ طلب رہوں گا میں

زبان پہ نام نہ لاؤں گا اِس علاقے کا
پلٹ کر اپنے عزیزوں میں جب رہوں گا میں

یہ اور بات ہے اِس خاکداں پہ اُس کے بغیر
زیادہ وقت نہ یوں بے سبب رہوں گا میں

مرے قریب نہ آئے گا کوئی غم ساجدؔ
نویدِ نعمتِ موجِ طَرب رہوں گا میں

غلام حسین ساجدؔ

کسی کے دھیان میں روتا ہوں اور ہنستا ہوں
میں اک چراغ ہوں اور نیند کو ترستا ہوں

ہزار سال میں بدلی نہیں مری خصلت
مجھے جو دودھ پلائے ، اُسی کو ڈستا ہوں

بکھر نہ جائے کہیں کاروانِ حرف وصوت!
اگر میں رَخشِ سماعت کے بند کستا ہوں

غُبارِ ہجر سے باہر نکل کے دیکھو تو!
میں ابرِ وصل ہوں اور ٹوٹ کر برستا ہوں

قریب اگر کوئی جوہر شناس ہے تو سُنے
میں بے مثال ہوں لیکن بہت ہی سستا ہوں

وہی فضا ، وہی منظر ، وہی نگر ساجدؔ
اُسی گلی میں، اُسی گل کدے میں بستا ہوں

☆☆☆

غلام حسین ساجدؔ

سزا ملی ہے اگرچہ زیادہ سخت نہیں
میں کم نصیب ہوں لیکن سیاہ بخت نہیں

پڑا نہیں ابھی دُنیا سے واسطہ مجھ کو
کہ میرے پاؤں میں زنجیرِ سازورَخت نہیں

کھلی ہے آنکھ کسی اور ہی ستارے پر
یہ میرے لوگ نہیں ہیں، یہ میرا تخت نہیں

بہت اُداس ہوں میں دشتِ نجد میں کہ یہاں
گیاہ وگُل کی کمی ہے، کوئی درخت نہیں

میں اُس گلی سے گزرتا ہوں اعتماد کے ساتھ
کہ نقدِ دل ابھی یک جا ہے، لختِ لخت نہیں

ہے میرے دل میں بہت احترام اُس گل کا
وہ بد زُبان ہے ساجدؔ مگر کرخت نہیں

غلام حسین ساجدؔ

کیا ضروری ہے کہ چپ چاپ پڑا رہتا ہو
ہم جو ارشاد کریں وہ بھی وہی کہتا ہو

کوئی دیوانہ کہاں شہر میں اب میرے سوا
خوش دلی سے جو ترے رنج وستم سہتا ہو

میرے چہرے سے عیاں ہوتی ہے میری حالت
میں وہ دریا نہیں جو زیرِ زمیں بہتا ہو

اُن کو درکار ہے اِک دوست مگر شرط یہ ہے
بات کرتا ہو نہ آنکھوں سے غزل کہتا ہو

کون جانے اِسی گنجان اندھیرے میں کہیں
چشمۂ آبِ بقا سب کے لیے بہتا ہو

لَو دیئے جاتا ہو ساجدؔ کہیں شریانوں میں
لاکھ اوجھل ہو مگر پیشِ نظر رہتا ہو

☆☆☆

خاور اعجاز

لکھا جو تشنہ لبی کے جواب میں دریا
سمٹ کے رونے لگا تھا حباب میں دریا

بھنور نے پانی کی گردن دبوچ رکھی ہے
یہاں پہ آیا ہوا ہے عذاب میں دریا

کبھی کناروں سے شکوہ، کبھی تہوں سے گلہ
تمام عمر رہا پیچ و تاب میں دریا

حروف سوکھ گئے ہیں مگر بتاتے ہیں
کبھی رہا تھا ہمارے نصاب میں دریا

جو اپنے پاس ہے وہ اُس کی نذر قطرۂ آب
ہمیں ملے نہ ملے اِس ثواب میں دریا

نہیں خبر کہاں جاگے گا کون سا منظر
گزر رہا ہے ابھی تک تو خواب میں دریا

اک ایسا شخص مرے دشتِ جاں میں رہتا ہے
جو چپ میں ایک سمندر، خطاب میں دریا

کتابِ غم میں کہیں اشک تک نہیں رکھتے
بہاتے رہتے ہیں بس انتساب میں دریا

اُبھر رہا ہے پھر اپنی ہی پیاس سے صحرا
اُتر رہا ہے پھر اپنے سراب میں دریا

نکل کے پردۂ آبی سے ریگ زار ہوا
دکھائی دیتا تھا یوں تو حجاب میں دریا

جو ہم سے چھینا کیے بوند بوند پانی کی
دیا گیا ہے اُنہیں کس حساب میں دریا

بہے تھے یاد میں اُس کی جو اشک آنکھوں سے
لکھا گیا اُنہیں طاعت کے باب میں دریا

پڑا ہے پاؤں پسارے جو اَب سرِ ساحل
یہ ڈیلٹا ہی تھا عہدِ شباب میں دریا

☆☆☆

خاور اعجاز

چپ زمیں اور آسماں خاموش
اک ادا میں ہیں دو جہاں خاموش

حادثے کا سراغ دیتا نہیں
آگ لگنے پہ ہے دھواں خاموش

اک تکلّم کی حد پہ جا کے ہوا
لا مکاں کی طرح مکاں خاموش

گفتگو چل رہی تھی دل کے ساتھ
یک بیک ہو گئی زباں خاموش

بولتے ہیں ازل ابد میرے
میں ہوں دونوں کے درمیاں خاموش

ایک آواز آ رہی تھی ابھی
زندگی ہو گئی کہاں خاموش

آدمی بولتا ہے اُس جا بھی
جس جگہ ہیں کروبیاں خاموش

گونج اُٹھی ہوا چراغوں میں
جو جہاں تھا ہوا وہاں خاموش

ہم کھڑے ہیں مقامِ برزخ پر
کوئی انکار، ہُوں نہ ہاں، خاموش

اب تو تاریخ ہی بتائے گی
ہم ہوئے ہیں کہاں کہاں خاموش

چاپ رُوحِ سفر کی ہے ورنہ
کارواں، میرِ کارواں خاموش

ہم بھی چپ سادھ لیں کہ دنیا میں
ہوتے جاتے ہیں ہمرہاں خاموش

چٹکلہ کوئی، دل لگی کی بات
کیوں ہو یارانِ خوش دہاں خاموش

دل دھڑکنے کی اک صدا کے سوا
لگ رہے ہیں یہ دو جہاں خاموش

☆☆☆

خاور اعجاز

وہ خواب تھا کہ اِسی سمت آ رہے تھے اُفق
لگا تھا جیسے اُفق سے اُٹھا رہے ہیں اُفق

یہ آنکھ ایک سا منظر نہیں دکھاتی کیوں
کبھی قریب کبھی دُور جا رہے ہیں اُفق

جنہیں خود اپنے اُبھرنے نہ ڈوبنے کی خبر
ہمارے واسطے کیونکر بچھا رہے ہیں اُفق

کسی کے واسطے دو گز زمیں نہیں دیتے
نمائشوں میں جو ہم کو دکھا رہے ہیں اُفق

ستارے ڈوب رہے ہیں اگر اُفق کے پار
تو کس خیال میں یہ ہم سجا رہے ہیں اُفق

فضا میں ایک سیاہی سی گھلتی جاتی ہے
یہ کون لوگ ہمارے بنا رہے ہیں اُفق

سنہرے وقت کی تصویر ہی نہیں بنتی
کہیں سے چاند کہیں پر سے لا رہے ہیں اُفق

یہ جانتے ہیں کہ صبح آ گئی تو کیا ہوگا
سحر کے شوق میں لیکن جلا رہے ہیں اُفق

کچھ اور آگے لیے چل صدائے نامعلوم
تری طلب میں نظر سے گنوا رہے ہیں اُفق

چلا ہوں کھول کے پر، بند کر کے آنکھوں کو
کہ اک زمانے سے مجھ کو بُلا رہے ہیں اُفق

نظر جو چاند ستاروں سے بھر کے بیٹھے ہیں
وہ چلمنوں کی بجائے گرا رہے ہیں اُفق

کوئی اُفق بھی ہمیں راس آ نہیں پایا
اک ایک کر کے بس اب تو گنوا رہے ہیں اُفق

لکھا کیے تھے سرِ آسمانِ شوق جو لوگ
یہ کیا ہوا کہ وہ خود ہی مٹا رہے ہیں اُفق

چلا گیا تھا وہ اِس پار چھوڑ کر مجھ کو
بس اُس کے بعد سے مجھ سے خفا رہے ہیں اُفق

☆☆☆

خاور اعجاز

خیمۂ حبس پر جو تانی ہَوا
چل پڑی پھر سے سہ زمانی ہَوا

تیرے میرے چمن مٹاتی ہے
گُل کھلاتی ہے درمیانی ہَوا

اُڑ رہے ہیں اُدھر نئے پتے
جا رہی ہے جِدھر پرانی ہَوا

رُخ بدل دیتی ہے سفینوں کا
بات کرتی نہیں زبانی ہَوا

اُس کا دامن ذرا جلا جونہی
پھر چراغوں کی اک نہ مانی ہَوا

اک طرف شعلۂ نفس کی لپک
دوسری سمت خاک ، پانی ، ہَوا

ٹھہرا رہتا ہے حبس کا موسم
آتی جاتی ہے آنی جانی ہَوا

اب تلک سر جھکائے ہیں وہ دیے
کر گئی جن پہ حکمرانی ہَوا

ایک اُڑتی ہوئی خبر کے ساتھ
دوڑتی پھرتی ہے دوانی ہَوا

خوشبوئے دوست آ رہی ہے مجھے
کر رہی ہے جو میہمانی ہَوا

کر گئی سینہ بھی تہہ و بالا
میرا اک دکھ مگر نہ جانی ہَوا

ایک افسانہ بُن رہی ہے ابھی
ق
میرے اطراف داستانی ہَوا

سرحدِ سانس پر کھڑا ہوں میں
لینے آئی ہے جاودانی ہَوا

سر پہ ابرِ بہار چھایا ہے
اور چاروں طرف ہے دھانی ہَوا

پرِ پرواز بھی مہیا کر
اے مری ہم سفر سہانی ہَوا

لیے پھرتی ہے کُو بہ کُو مجھ کو
عہدِ پارینہ کی نشانی ، ہَوا

قید خاکِ قفس سے کر آزاد
لے چل آگے اب آسمانی ہَوا

جمع کرتی ہے برگِ زرد مرے
پھر سناتی ہے اک کہانی ہَوا

عام کر دے مری مہک ہر سُو
مجھ پہ کر دے یہ مہربانی ، ہَوا

☆☆☆

ڈاکٹر خیال امروہوی

چلا بھی جاؤں یہاں سے تو کچھ نہیں ہوگا
کہ مجھ سے بڑھ کے کوئی اور جانشیں ہوگا

جو جا چکا اُسے گم گشتہ کیوں خیال کریں
وہ اپنا روپ بدل کر یہیں کہیں ہوگا

وہ نامراد ہے جو عہد بد سے دُور رہا
وہ کامیاب ہے جو حاشیہ نشیں ہوگا

جلا کے راکھ کیا خود کو بھوک کے ہاتھوں
اب اور سانحہ کیسا سرِ زمیں ہوگا

خلاء سے بوزنہ شکلیں زمیں پہ اُتریں گی
یہاں نہ کوئی سمن رُو نہ مہ جبیں ہوگا

خبر کرو کہ توقع نہ خُلد کی رکھنا
کہ شیخ موت سے پہلے وہاں مکیں ہوگا

گیا وہ عہد کہ جس میں اُمید رکھتے تھے
کہ جام و ساز کے ہمراہ نازنیں ہوگا

ہزار تجزیے نوکِ قلم سے نکلے ہیں
مگر جو عقل کہے گی وہی نہیں ہوگا

ڈاکٹر خیال امروہوی

انقلاب آیا تو فردا صندلیں ہو جائے گا
آدمی تو اک طرف یزداں حسیں ہوجائے گا

دیدۂ بینا کو ہے اُس روز کا اب انتظار
جس میں انساں کا چلن عہد آفریں ہوجائے گا

اب کے اس انداز سے ہوگا جدالِ انتقام
رُبعِ مسکوں کا لبادہ احمریں ہوجائے گا

ہم بھی اُس دن چھوڑ دیں گے اپنا یہ طرزِ سخن
جھونپڑا جس وقت قصر مرمریں ہو جائے گا

حُسنِ ظن ہے چیتھڑا تہذیب کی اقدار سے
بھیڑیوں کا شہر فردوسِ بریں ہو جائے گا

ناتوانی عارضی ہے پنجۂ مزدور کی
چیر کر رکھ دے گا جس دم آہنی ہوجائے گا

کیچلی آ کر اُتارے گا نجس تہذیب کی
آدمی انسان کا جب جانشیں ہو جائے گا

بانٹ دے اب بھی تہی دستوں میں فاضل جنس کو
ورنہ جو کچھ پاس ہے غارت یہیں ہو جائے گا

زہر غم کو گاہے گاہے چاٹتے رہیے خیالؔ
زہر ہی اک مرحلے پر انگبیں ہوجائے گا

ڈاکٹر خیال امروہوی

طلب کی مسلکِ بے خوف میں جھلک بھی نہیں
زمیں تو کیا ہے نظر جانبِ فلک بھی نہیں

افق پہ وحشتِ فردا کی شعلہ باری سے
شفق کی شال میں لپٹی ہوئی دھنک بھی نہیں

لبِ شگفتہ کے حساس گھونٹ کیا ملتے
نصیب شوخیِ میخانہ رنگ تک بھی نہیں

جہاں وجود کی پرچھائیاں عدم ٹھہریں
تو لاوجودیِ انساں میں کوئی شک بھی نہیں

نظامِ زر کو جلا کر جو راکھ کر ڈالے
تغیرات کے شعلوں میں وہ لپک بھی نہیں

کچھ ایسے گھر بھی ملیں گے کہ جن کے حصے میں
تکلفات تو کیا نان اور نمک بھی نہیں

ڈاکٹر خیال امروہوی

اندمالِ زخم کیا ہو چارہ گر ملتے نہیں
چارہ گر ملتے ہیں لیکن معتبر ملتے نہیں

جس سے آتی ہے جہانِ خشک میں شعلہ وری
اس صدی میں تو کم از کم وہ شرر ملتے نہیں

سحر کر جاتے ہیں خود آ کر غزالانِ ختن
ڈھونڈنے نکلیں تو ظالم عمر بھر ملتے نہیں

بھول کر بھی نخلِ خود رَو پر نہ پتھر پھینکئے
اس کمینی ذات سے ہرگز ثمر ملتے نہیں

پیکرِ نخوت کی صورت اُن سے ملنا چاہیے
جو تواضع سے کسی بھی موڑ پر ملتے نہیں

جرأتِ پرواز ملتی ہے مشیت سے جنہیں
اُن کو فطرت کی طرف سے بال و پَر ملتے نہیں

بال و پر سے جن کو کرتا ہے زمانہ سرفراز
سوءِ قسمت سے انہیں قلب و جگر ملتے نہیں

سیکھ لیں گر سیکھنا ہے حکمت فرزانگی
ہم سے اس دنیا میں پھر آشفتہ سر ملتے نہیں

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

خاموش سے اب رہتے ہیں دالان مری جان
آباد مکاں یوں ہوئے ویران مری جان

ہم لمحۂ موجود گنوایا نہیں کرتے
ہو جائے جو ہونے کا ہے امکان مری جان

ہر لمحہ نئے رنگ دکھاتا چلا جائے
آغاز سے ہم لوگ ہیں حیران مری جان

دیوار کے اس سمت نہ اس سمت ہے کوئی
یہ رمز سمجھنا نہیں آسان مری جان

بکھرے ہوئے کچھ خواب ہیں ٹوٹے ہوئے رشتے
بس اپنا تو اتنا سا ہے سامان مری جان

اک عمر انہی گلیوں میں گو ہم نے گزاری
ہیں شہرِ سخن میں ابھی انجان مری جان

فہیم شناس کاظمی

در کھلا ایک کہکشاں کا ہے
اور یہی رنگ آسماں کا ہے

زندگی رنگ و بو کا ہے موسم
گویا اک سلسلہ گماں کا ہے

دسترس لا مکاں پہ ہے لیکن
خواب آنکھوں میں اک مکاں کا ہے

نام سن کر مرا فہیم شناسؔ
پوچھیں وہ کون ہے، کہاں کا ہے

ہم گھر سے چل پڑے تھے صداؤں کے ساتھ ساتھ
پھر ساری عمر گزری ہواؤں کے ساتھ ساتھ

کچھ یوں فنا کے ساتھ فنا ہے جُڑی ہوئی
جیسے ہو تیز دھوپ سی چھاؤں کے ساتھ ساتھ

منزل قبولیت کی ہے اتنی کڑی شناسؔ
دستِ دعا گرا ہے دعاؤں کے ساتھ ساتھ

☆☆☆

اوصاف نقوی

اک حرفِ سادہ جان تُو لوحِ گمان پر
مانندِ نقشِ پا ہوں ترے آستان پر

رنگِ جہان رنگِ شرافت کو کھا گیا
تہذیب رو رہی ہے مرے ہر جوان پر

بازار میں ضرورتوں کے آئینے کے ساتھ
چہرہ سجا ہوا ہے ہر اک کی دکان پر

سہما ہوا ہے ذہن کے دامن میں اک خیال
پہرے بٹھا دیئے ہیں کسی نے دھیان پر

ہیں جس کی ڈور میں مرے دشمن کی سازشیں
اُڑتی ہوئی پتنگ ہوں وہ آسمان پر

اوصافؔ ہر عمل کا ہے ردِعمل کوئی
دانتوں کا پہرہ سخت لگا دے زبان پر

اوصاف نقوی

اُجڑے ہوئے لوگوں کو میں دیتا ہوں دلاسے
چھپتا ہوں تو کیوں اپنی نگاہوں کی ضیا سے

آدم تری اولاد کی سوچوں میں خلل ہے
دولت ہے تو باغی ہوئی جاتی ہے خدا سے

اک حرفِ تمنا نے کیا حال کچھ ایسا
آنکھوں میں سمندر ہے مگر لب ہیں پیاسے

انسان کی تکریم ہے ہر چیز سے اولیٰ
معلوم ہوا مجھ کو غلط تیری اَنا سے

وہ اور تھے جن پر تھی ہوئی دن کی سخاوت
ہم کو تو ملی رات ترے جودو سخا سے

دو قدموں پہ اسلام کی اوصافؔ ہے منزل
کعبہ کو جو جانا ہے چلو کرب و بلا سے

☆☆☆

محمد فیروز شاہ

اک گھنے جنگل سے کرنیں برسرِ پیکار ہیں
ایسا لگتا ہے یہ میرے عہد کے فنکار ہیں

ہم نہ ہوں تو ماند ہے تصویرِ حسنِ کائنات
ہم پہاڑوں کی طرح گرچہ زمیں پر بار ہیں

ہم سفر بادِ خزاں کے پتے ہو جائیں گے سب
ہے ابھی عہدِ بہاراں پیڑ کے سب یار ہیں

بانٹتا ہے پیار کی خوشبو جہاں میں چار سُو
دامنِ گل میں مگر میرے لیے تو خار ہیں

ساری سج دھج ہے فقط فیروزؔ، اک دن کے لیے
کل کو جو بے کار ہو جائے گا وہ اخبار ہیں

محمد فیروز شاہ

ہم قرینِ منزلِ مقصود رستہ کھو گئے
رات بھر جاگے سحر ہونے لگی تو سو گئے

آبلہ پائی انہی کی لائقِ تحسین ہے
جو شکستہ پا نویدِ منزلِ نَو ہو گئے

خود فنا ہو کے دیا کرتے ہیں اوروں کو نکھار
دیکھ تو شبنم کے آنسو گل کا چہرہ دھو گئے

مادرِ مشفق کی صورت اس نے پالا تھا جنہیں
نفرتوں کے بیج اس دھرتی میں وہ بھی بَو گئے

رہبرانِ کارواں بے راہرو ہونے لگے
کیا ستم ہے نور کے قاسم بھی اندھے ہو گئے

☆☆☆

عطاء الرحمٰن قاضی

وہ غم جو وادیِ امکان میں چمکتا ہے
کبھی کبھی تو مرے دھیان میں چمکتا ہے

تلاش کر نہ طربِ خانۂ ہوا میں اسے
زرِ نشاط ہے ، طوفان میں چمکتا ہے

اور اب تو یوں ہے سحر تاب ہر اشارہ ترا
پڑا ہوا کسی زندان میں چمکتا ہے

وجود خستہ کی پُر کیف آرزو کا دیا
سو اب بھی وسعتِ ویران میں چمکتا ہے

وہ کون ہے جو پسِ لمسِ اعتبار ، عطاؔ
لہو کی طرح ، رگِ جان میں چمکتا ہے

عطاء الرحمٰن قاضی

ہر ابتدائے صبح کا انجام دیکھنا
منظر نیا فلک پہ سرِ شام دیکھنا

حسرت نے اعتبارِ تمنا مٹا دیا
خود سے اُلجھ پڑا دلِ ناکام دیکھنا

اک خواب کی شکست نے بے حال کر دیا
برپا ہے شہرِ ذات میں کہرام دیکھنا

ہے کون جلوہ گر یہ سرِ عرصۂ خیال
ہر سو چمک اُٹھے ہیں در و بام دیکھنا

ہے خوب ، سیرِ گلشنِ امکاں مگر عطاؔ
فرصت ملے جو ، وادیِ کالام دیکھنا

☆☆☆

ظفر اقبال نادر

محبت کے رشتہ مٹانے لگا ہے
کوئی لے کے جاں میری جانے لگا ہے

خدا پر یقیں اور پختہ ہوا ہے
میں روٹھا ، وہ مجھ کو منانے لگا ہے

کہو اہلِ دل سے کہ تھامیں جگر کو
وہ زلفوں میں کلیاں سجانے لگا ہے

ہے گفتار میں اک نیا پن وہ لایا
اشارے ، نگاہیں نچانے لگا ہے

میں حیراں ہوا دِل کی خواہش بتا کر
وہ دانتوں میں آنچل دبانے لگا ہے

یہ ثابت ہوا جھوٹ کہتے ہو لازم
جو قسموں پہ قسمیں اُٹھانے لگا ہے

ترا ہم نوا ہو گیا ہے یقیناً
زمانہ جو ہم کو ستانے لگا ہے

حقیقت کو پا کر سبھی دوستوں کی
ظفر سائے سے خوف آنے لگا ہے

طارق عزیز

یاد آئے بھلا بھی دیتا ہوں
خود کو ایسے سزا بھی دیتا ہوں

دل کے پنجرے سے تیری یادوں کے
بند پنچھی اُڑا بھی دیتا ہوں

ہے ستم یہ کہ میں ستم گر کو
زندگی کی دعا بھی دیتا ہوں

بھول بیٹھا ہوں داستانِ غم
گر سنے تُو سنا بھی دیتا ہوں

جا نکل جا تُو میرے دشمن پھر
میں تجھے راستہ بھی دیتا ہوں

مانندِ درد دل سے اُٹھتا ہے
میں جسے دل میں جا بھی دیتا ہوں

دوستو مت سنو فسانۂ دل
ہنستے ہنستے رُلا بھی دیتا ہوں

اپنی ہستی میں کھو گیا طارقؔ
تُو ملے تو ملا بھی دیتا ہوں

☆☆☆

حروفِ زر

(قارئین کے خطوط)

انگارے شمارہ ۲۰ موصول ہوا۔ گرمی کی شدت اور حدت، کرۂ التہاب سے قربت اس پر انگارے جریدے کی شعلہ باری۔ ہمیں کون سی خوراک ملتی ہے کہ فلسفے کی اصطلاحات بہ آسانی ہضم کرسکیں۔ ابن حسن صاحب کی فلسفیانہ تحریر ''ادب اور معروضیت'' انتہائی خضوع وخشوع سے پڑھی، سمجھنے کی کوشش کی۔ ادب اس قدر بھی ثقیل اور جان لیوا نہیں کہ جسے سمجھنے کے لیے تمام دنیا کے فلسفیوں کا بالترتیب مطالعہ کیا جائے۔ ادب خوب صورت طرز اظہار ہے۔ اگر اس میں تخلیقی حُسن نہ ہو تو فلسفے کا نصاب بن جاتا ہے جب کہ گذشتہ اور رواں صدی میں سابقہ فلسفیانہ نظریات اور اصطلاحات تقریباً منسوخ ہو گئے ہیں اس کی جگہ سائنسی تجربات نے لے لی۔ اب فلسفہ برائے فلسفہ نہیں بلکہ فلسفہ برائے سائنس اور سائنس برائے فلسفے کی بات کچھ سمجھ میں آجاتی ہے۔

مارکسی فلسفہ سائنسی سلسلہ ہے کہ اُس نے فطرت اور سماجی جدلیات اور اس کے نتائج کو تاریخی رفتار کے ساتھ دیکھا اور سمجھایا ہے کہ سماج تاریخی عمل اور پیداواری وسائل کے حوالے سے مختلف معاشرے بناتے رہے ہیں اور ہر دَور کا سماج پیداواری عمل سے ہی ارتقائی سماج میں منتقل ہوتا رہا ہے اور یہ کہ سماجی ارتقا میں جغرافیائی ماحولیات کا بھی عمل دخل رہا ہے۔ انسانی نفسیات، اخلاقیات وغیرہ اقتصادی انفراسٹرکچر کے ہی تابع ہوتے ہیں گویا سماجی اخلاقیات اقتصادیات کے تابع ہوتی ہے نہ کہ اقتصادیات اخلاقیات کے تابع! لہٰذا مجرد فلسفہ اہمیت نہیں رکھتا۔

دنیا میں جتنے چھوٹے شہر بڑے شہروں میں تبدیل ہوئے وہ پیداواری وسائل کی خرید وفروخت کا مرکز تھے۔ انہیں شہروں میں انسانوں نے اپنے روحانی اور وجدانی تسکین کی خاطر عبادت گاہیں بنائیں، مختلف خداؤں کی تشکیل واختراع، ماورائی مذاہب کی ایجاد، ماضی کی تجارتی منڈیوں ہی سے وابستہ رہیں۔ فلسفہ قیاسی علم ہے جب کہ منطق سائنسی تجرباتی علم ہے جب کہ منطق بھی استقرائی اور استخراجی شعبوں کی وجہ سے کچھ زیادہ اثباتیت لیے ہوئے ہیں بنیادی موضوع اقتصادیات ہے۔ آج جس بُری طرح قتل وغارت ہو رہا ہے اس کا کوئی فلسفہ یا منطق نہیں ہے بلکہ زر، زمین اور عورت ہے۔ یہ خون خرابے کسی اشراقی، شائی، اعتزالی، تصوریت، عینیت یا مثالیت کی اصطلاحوں کی وساطت سے سمجھ میں نہیں آتے بلکہ پیداواری وسائل کی عدم مساوات کا نتیجہ ہیں یعنی مساوات کی نفی عدم مساوات ہے اور عدم مساوات کا synthesis قتل وغارت ہوا۔ زیرِ نظر انگارے کا اداریہ اہم سوالات سے معمور ہے۔ سائنسی ایجادات نے الفاظ کی کثرت کو محدود کر دیا ہے اس لیے ان کی حرمت بھی ختم ہو گئی اب انسان اپنی دو قوتوں

سے کام لینے کا عادی ہو گیا۔ بصارت اور سماعت یہ دونوں قوتیں ٹی۔وی، ہیڈفون اور دیگر الیکٹرومیگنیٹک آلات سے وابستہ ہیں۔ دماغ کی چنداں ضرورت ہی نہیں رہی۔ جاننے، پہچاننے، پرکھنے کا عمل ختم ہو گیا لہٰذا یہ شکوہ چنداں منطقی نہیں ہے کیونکہ جب وہ مشینیں نہیں تھیں تو کتابی علم کی ضرورت تھی۔ جب سمعی بصری آلات انسان نے بڑی محنت سے ایجاد کر لیے تو فکری تخلیقی عمل کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اب زبان بھی کمپیوٹرائزڈ ہوتی جا رہی ہے۔ ریاضی میں نثر و نظم کی کیا توقع لیکن یہ تجزیہ فائنل نہیں ہے انسان متلون المزاج مخلوق ہے۔ یہ مخلوق تاریخی اعتبار سے زوال سے کمال کی طرف اور پھر کمال سے زوال کی طرف، اسی طرح عمل سے بے عملی اور بے عملی سے عمل کی جانب آنے جانے کی عادی رہی ہے۔ انگارے میں نظم کا حصہ بہت جاندار ہوتا ہے۔ بالعموم نثر نگار شاعروں سے اس لیے جلتے ہیں کہ شعرا اپنے ایک شعر میں پورا مقالہ سمو دیتے ہیں اور وہ حتمی یعنی فائنل بھی ہوتا ہے۔ اس مرتبہ ارشد ملتانی کے اشعار نے بے حد متاثر کیا۔ خاور اعجاز بڑے قادرالکلام شاعر ہیں ان کی غزلیں بے حد پسند آئیں۔ قیوم طاہر کا اپنا لہجہ اور ڈکشن ہے، روایت کے ساتھ درایت نے بڑا لطف بہم پہنچایا۔ پرویز ساحر جدید لب و لہجے کے شاعر ہیں، اچھی غزل کہتے ہیں، دیوان پر دیوان اہل ذوق کے سپرد کرتے ہیں دل نواز دل کا کلام ہمیشہ متاثر کرتا ہے۔ محمد فیروز شاہ کا کلام سرمدی کیف و رنگ کا حامل ہوتا ہے۔ فیروز شاہ نے ادوار شاعری میں سنجیدگی اور عالمانہ اظہاریت کا ثبوت دیا ہے۔ نوازش علی ندیم، منور عزیز، عطاء الرحمٰن قاضی کا کلام خوب ہے، عطاء الرحمٰن تمثیل کے عنوان نے اور ان کے تخلیقی عمل نے متاثر کیا۔ راج کنور کی ویلنٹائن ڈے فکر انگیز نظم ہے۔

(ڈاکٹر خیال امروہوی۔ لیہ)

کسی طرح کے بھی خیالات ہوں، ہم یا تو اس سے متفق ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے۔ میں بامعنی تحریروں کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ متفق ہوتے ہوئے دلائل کا وزن ہی ہمیں متاثر کرتا ہے۔ بغیر دلائل کے کسی چیز کو تسلیم کر لینا عقیدہ پرستی ہے جو سوچنے کے عمل کی نفی ہے۔ ایسی تحریر جس سے ہم متفق نہ ہوں، اگر دلائل سے خالی ہو تو وہ ناقابل بیان ہو گی لیکن ایسی تحریر میں جو بھی دلائل ہوں ہمیں سوچنے کا مواد ضرور مہیا کریں گے اور اسے رَد کرنے کے لیے ہمیں ان دلائل کا دلائل سے جواب دینا ہو گا۔

ایک تیسری قسم کی تحریر بھی موجود ہے بلکہ کثیر تعداد میں منظر عام پر آ رہی ہے۔ اس میں کوئی دلیل، کوئی خیال، کوئی بحث، کسی قسم کی بامعنی بات پائی نہیں جاتی۔ یہ اس قدر زیادہ ہے کہ اس کو ختم کرنا ڈان کوئیٹے (Don Quixote) کی برائی کے خلاف مہم جوئی جیسا ہو گا۔ ان کے خلاف بحث کرنا بھی وقت کا ضیاع ہے (جو میں اب کر رہا ہوں) جیسے ان لوگوں کو لکھنے کی ترکیب ہاتھ لگ جاتی ہے اور پھر وہ لکھے چلے جاتے ہیں۔ ایسی خوراک کی طرح جو نہ تو خوش ذائقہ ہے نہ بدذائقہ، بلکہ جس کا کوئی ذائقہ ہی نہیں vapid۔ مثلاً شاعری میں ایسے مجموعے جن کو صرف شاعر کے بیوی اور بچے پڑھتے ہیں اور بڑے فخر سے دوسروں کو بتاتے ہیں، ''یہ میری امی کی کتاب ہے'' یا ''یہ میرے ابو کی کتاب ہے''۔ انگارے کو فخر

حاصل ہے کہ اس نے ''خطوط'' کی ایسی قسم دریافت کی ہے جن کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ یہ ''فلاں کا خط ہے'' یا ''یہ خط مجھے ارسال کیا گیا ہے۔'' اندازہ لگائیے جو انہیں طمطراق سے اکٹھا کر رہا ہے، مطلب یہ نہیں کہ ذاتی خط نہیں لکھے جاتے، اگر ہم نے صرف ایسے خطوط پڑھنے ہیں تو دسویں بارہویں کی اُردو گرائمر کی کتاب کھول لیں اور انہیں رٹ لیں اور پھر دسویں کا امتحان پاس کر لیں۔ ایک ادبی رسالے میں چھپنے والے خطوط صرف اسی وقت کوئی اہمیت اختیار کرتے ہیں جب ان میں وسیع تر زندگی کے بارے میں کوئی بات ہو۔ ایک فرد کی ذات وسیع اور بڑی ہو کر دوسرے کے لیے اہمیت اختیار کرے۔ حیرانی کی بات ہے کہ انہیں ''سوغات'' کہا گیا ہے۔

مثال کے طور پر خود انگارے میں ''حروفِ زر'' کے عنوان سے جو خط شائع ہوتے ہیں، ان میں کہیں بھی صرف اور صرف ذاتی بات نہیں ہوتی۔ میرے پاس پیسے نہیں رہے، یا مجھے پیسے آ رہے ہیں یا مجھے آپ کی کتاب مل گئی، یا دس روپے کا چیک ملا، فلاں کتاب کباڑیوں سے ڈھونڈو۔ اگرچہ ان میں اکثر اوقات معیاری گفتگو کم ہی ہوتی ہے۔ زیادہ تر اس قسم کے فقرے، فلاں مضمون بہت اچھا ہے، نظمیں غیر معیاری تھیں، فلاں مصرعے وزن سے گر گئے تھے۔ چلیں یہ کچھ بھی برداشت ہو جاتا ہے لیکن اس طرح کی باتیں ایسے رسالے کو زیب نہیں دیتیں جو اپنے آپ کو ترقی پسند ادب کا ترجمان کہتا ہے۔ جن صاحب کو یہ خطوط چھپوانے کا شوق ہے انہیں چاہیے کہ کسی بھی ادبی موضوع پر کچھ لکھیں۔

(ابنِ حسن۔ گوجرانوالہ)

انگارے کا بیسواں شمارہ ملا تو حسب روایت ایک ہی نشست میں پڑھ لیا۔ طویل بھرتی کے مضامین سے بہتر ہے کہ اسے اسی انداز میں جاری رکھا جائے تاکہ دلچسپی کا عنصر قائم رہے۔ آپ کی ''چند باتیں'' ہمیشہ کی طرح لفظ کی حرمت، آزادی اظہار، خرد افروزی اور برداشت کے کلچر کا پُر اُمید پیغام لیے ہوئے ہیں۔ مجھے محض اتنی سی شکایت ہے کہ آپ ہر مرتبہ رخصت ہوتی ان اقدار کا نوحہ تو پڑھ لیتے ہیں مگر انہیں پھر سے رائج کرنے کے ہُنر کیا ہیں اور کیونکر انہیں تلاش کیا جا سکتا ہے؟ یہ پہلو تشنہ رہتا ہے۔ مضامین کے گوشے میں ڈاکٹر فاروق عثمان اور غلام حسین ساجد کے مضامین اپنی فکر و بیان کے اعتبار سے عمدہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مطالعہ اُستاد ہیں۔ غالب کی فارسی سے محبت اور اُردو سے بے اعتنائی کا موضوع اگرچہ نیا نہیں لیکن انہوں نے جس انداز سے اسے پیش کیا اور حوالوں سے اپنی بات کو اعتبار بخشا وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔ ممکن ہے بعض غالب شناس اس نقطہ نظر سے اختلاف بھی کریں مگر سچ تو یہ ہے کہ بات دل کو لگتی ہے۔ غلام حسین ساجد نے ڈاکٹر مبارک کی جن دو کتب کو تبصرے کے لیے منتخب کیا ہے وہ یقیناً لائق توجہ ہیں۔ ساجد صاحب نے تبصرے کو وقار بخشا ہے اور بات محض ان کتب کے صفحات کی تعداد، موضوعاتی تقسیم، ابواب بندی یا ناشر کے نام تک نہیں رہی بلکہ مبصر کا اپنا نقطہ نظر اور فنِ تاریخ نگاری سے متعلق تحفظات و نظریات کا پتہ بھی مل رہا ہے۔ کاش ہم کبھی اپنی حقیقی تاریخ جان پائیں اور سرکاری مراعات یافتہ

محبّ وطن مورخوں کا احتساب ممکن ہو جو معصوم ذہنوں کو تعصّبات و نفرتوں کی دیگچیوں میں ڈالے حب الوطنی اور اسلام دوستی کی آنچ پر سلگا رہے ہیں۔ نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ڈاکٹر مظفر عباس کا مضمون بیرونِ ملک سرکاری نشستوں پر بیٹھے دانشوروں کا اُسی نوع کا روایتی مضمون ہے جو بہر حال ان نشستوں پر آسودہ حال رہنے اور مدتِ ملازمت کی توسیع میں لکھا جاتا ہے۔ یوں بھی پاکستانی ہونے اور خصوصاً محبّ وطن پاکستانی ہونے کا تقاضہ بیرون ملک کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ بات یہیں تک رہتی تو بشری مجبوری تصور ہوتی نہ جانے انہوں نے اسے چھپوانا کیوں ضروری خیال کیا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا شمار یقیناً اُردو کے نامور اور پڑھے لکھے اساتذہ میں ہوتا ہے لیکن مکاتیب کے نام پر اُنہوں نے جو رقعے چھپوائے ہیں وہ تحقیق کے کون سے بند دروا کر رہے ہیں میری کم فہمی اُن تک رسائی حاصل نہیں کر سکی۔ آصف فرخی یا محمد فیروز شاہ صاحب کا حُسنِ ذوق اس میں سے کچھ دریافت کرے تو یہ اُنہی کا کمال۔ افسانوں کے حصے میں احمد ندیم تونسوی نے علامت کو بیانیہ میں جس خوب صورتی سے سمویا ہے اس کے لیے وہ یقیناً داد کے مستحق ہیں۔ طویل افسانوں کی روایت اب پہلے کی سی نہیں رہی لیکن انہوں نے ہمارے سیاسی و معاشرتی تناظر اور آمریت کے طویل ادوار کے پس منظر میں جو کہانی بُنی ہے وہ اپنی زبان و بیان اور تکنیک ہر اعتبار سے شاندار ہے۔ رہا شاعری کا حصہ تو ارشد ملتانی اپنی ضعیف العمری کے باوجود جوان دکھائی دے رہے ہیں۔ نجم الاصغر شاہیا کی پہلی غزل خوب صورت ہے خصوصاً دوسرا شعر پسند آیا۔ اسی طرح احمد صغیر صدیقی کی پہلی غزل عمدہ ہے۔ ڈاکٹر خیال امروہوی کی گھن گرج حسب روایت قائم ہے۔ خاور اعجاز خوب شعر کہہ رہے ہیں۔ قیوم طاہر، پرویز ساحر اور فیروز شاہ کا کلام بھی یقیناً متاثر کرتا ہے۔ نظموں کے حصے میں شاہیا صاحب کی نظم بحث طلب ہے۔

(لیاقت علی۔ ملتان)

میں انگارے کا مستقل قاری ہوں۔ بیس پرچے باقاعدگی سے نکالنے پر مبارکباد۔ انگارے حقیقتاً ترقی پسند ادبی پرچہ ہے جس میں ہر موضوع اور ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والا چھپ رہا ہے۔ ورنہ ہوتا یہ ہے کہ مخالف نقطہ نظر نہ سنا جاتا ہے اور نہ ہی برداشت کیا جاتا ہے۔ انگارے کے تمام پرچوں کو سامنے رکھا جائے تو اس میں چھپنے والی تحریریں اپنے موضوعات کی وسعت اور تنوع پر حیران کرتی ہیں۔ لیاقت علی اور احمد ندیم تونسوی کے افسانے کی تخلیقی صلاحیت کا اظہار یہ ہیں۔ بیسویں شمارے میں شائع ہونے والے دونوں افسانے ''روشنی'' اور ''غبارہ موومنٹ'' عصری صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر بات ہو تخلیقی صلاحیت کے وفور، بیان کے متنوع قرینے اور خیال کی کئی پرتیں کی تو اس کی بہترین مثال احمد ندیم تونسوی کا افسانہ غبارہ موومنٹ ہے۔ انگارے میں شائع ہونے والے خطوط کے حوالے سے احمد صغیر صدیقی اور ابن حسن کے اعتراضات قابل توجہ ہیں۔

ابنِ حسن انگارے کا معتبر نام ہے۔ جمالیات کی دس اقساط اور حروفِ زر میں چھپنے والے

خطوط ان کے گہرے اور وسیع مطالعے کے ساتھ ساتھ مارکسی مکتبہ فکر سے گہری وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ''ایک مرد'' اور یانہ فلاشی کا ترجمہ خالد سعید کی ترجمہ پر مہارت کا ثبوت ہے لیکن اب اس کہانی میں ٹھہراؤ اور یکسانیت کا احساس ہونے لگا ہے۔ انگارے میں ادب اور زندگی کے حوالے سے اُٹھائے گئے سوالات زندگی اور ادب پر گہری نظر کا ثبوت ہیں اور دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ ہمارا ادیب اور قاری ایسی بے حسی کا شکار ہو چکے ہیں کہ ڈائیلاگ اتنی قوت سے جنم نہیں لیتا کہ تحریک بن سکے۔ میرے جیسا طالب علم اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ہر وہ لفظ جو ضابطہ تحریر میں آ چکا ہے اسے حقیقی تجزیے سے گزرنا ہے۔ خوب صورت سرورق، کارڈز اور سی ڈیز کا لالچ دے کر کتابیں بیچنے والوں کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ آج بھی لفظ کی حرمت اور اثر کے قائل لوگ موجود ہیں کم ہی سہی اور ہر دَور میں مقدار پر معیار کو ترجیح دینے والوں کی تعداد کم ہی رہی ہے۔

(مظہر عباس۔ خیر پور ٹامیوالی)

۔۔۔۔۔ احمد ندیم تونسوی کو کہاں سے دریافت کیا گیا ہے ۔۔۔۔۔ اس کے افسانے ''غبارہ موومنٹ'' نے تو حیران اور سرشار کر دیا۔ کیا غضب کا افسانہ ہے۔ میں اگر یہ کہوں کہ انگارے کے اس شمارے کی یہ سرتاج تحریر ہے تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ اللہ ہمارے جریدے کو ایسی تحریروں سے مزین رکھے۔۔۔۔۔

(محمد حامد سراج۔ چشمہ)

رسید و اطلاع:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)، یونس جاوید (لاہور)، ڈاکٹر معین الرحمٰن (لاہور)، حسن عابد (کراچی)، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم (میانوالی)، ڈاکٹر علمدار حسین بخاری (سرگودھا)، غلام حسین ساجد (لاہور)، ناصر حسین بخاری (اسلام آباد)، ڈاکٹر خیال امروہوی (لیہ)، صفدر حسین شاہ (سرگودھا)، ڈاکٹر صلاح الدین درویش (اسلام آباد)، قاضی عطاالرحمٰن (عارف والہ)، ظفر اقبال نادر (عارف والہ)، ڈاکٹر سعید اقبال سعدی (گوجرانوالہ)، ابن حسن (گوجرانوالہ)، سجاد مرزا (گوجرانوالہ) طارق اسد (لاہور)، ایم فیاض خالد (گجرات)، صابر عظیم آبادی (کراچی) صدف الطاف (لاہور)

☆☆☆